رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۳۰

شعبان ۱۳۷۷ھ جلد ۵۰ عدد ۲

ماہنامہ

# ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵ - اے ذیلدار پارک ، اچھرہ - لاہور پاکستان

چندہ سالانہ ۶ روپے قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

خالی صفحه

# ترجمان القرآن لاہور

# فہرست مضامین

جلد ۵۰ | بابت ماہ شعبان ۱۳۷۷ھ مطابق مئی ۱۹۵۸ء | عدد ۲



ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

# اشارات

ایک مومن و مسلم کے طرزِ فکر اور سیرت و کردار میں بعض دوسرے امتیازات کے علاوہ ایک نمایاں صفت یہ بھی پائی جاتی ہے کہ وہ کبھی بھی یاس و قنوط کا شکار نہیں ہوتا۔ دنیا کی اس جنگاہ میں وہ بعض اوقات شکست تو کھا سکتا ہے لیکن یہ شکست نہ تو اس کی ہمت کو پست کر سکتی ہے اور نہ اُس کے ارادوں کو مضمحل ہی کرنے میں کامیاب ہوتی ہے بلکہ اس کے برعکس یہ انہیں قوت و طاقت فراہم کر کے مضبوط سے مضبوط تر بناتی ہے۔ وہ حالات و واقعات کی نا مساعدت سے فطری طور پر متاثر تو ضرور ہوتا ہے لیکن اس سے مفتوح و مغلوب نہیں ہوتا۔ وہ گر کر سنبھلتا ہے، پٹ کر ہنستا ہے، چوٹ کھا لینے کے بعد نہ صرف اُسے برداشت کرتا ہے بلکہ مستقبل میں اس قسم کے حادثہ سے بچنے کے لیے مؤثر تدابیر اختیار کرتا ہے اور اس طرح اس کارگہِ حیات میں مخالفتوں اور مخاصمتوں کے علی الرغم ہمیشہ ہمت آزما رہتا ہے۔ ایک مسلمان درحقیقت ایک ایسا چراغ ہے جس کی زندگی کی لو رجائیت اور امید کے روغن سے جلتی ہے۔ اس کو نہ غیر مساعد حالات کے تند و تیز جھونکے گل کر سکتے ہیں اور نہ مخالفت کی آندھیاں اور مصائب و آلام کے تھپیڑے اسے بجھانے میں کامیاب ہوتے ہیں بلکہ جس نسبت سے مخاصمتوں کے جھکڑ تیز ہوتے ہیں اسی تناسب سے اس چراغ کی روشنی بھی تیز تر ہوتی چلی جاتی ہے

---

مسلمان کے فکر و عمل کی یہ کیفیت کسی قسم کے رواقی فلسفہ کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ اس بنیادی تصورِ حیات کے رُخِ زیبا کا ایک ہلکا سا عکس ہے جو ایک خدا پر ایمان لانے والا شخص اس کائنات کے بارے میں اختیار کرتا ہے۔ ایک بے خدا آدمی کے نزدیک کائنات کی اصل حقیقت مادہ ہے جو جواہر کے مجموعہ سے عبارت ہے، جن کی تشریح صرف طبیعیات کے اصولِ موضوعہ کے ذریعہ ہی کی جا سکتی ہے۔ اس

عالم میں جو کچھ موجود ہے وہ انہیں لگے بندھے ضابطوں کا پابند ہے۔ دنیا کے حالات و واقعات کسی بلند و بالا ہستی کی مصلحتوں کا نتیجہ نہیں اور نہ کوئی قوتِ حیات ایسی موجود ہے جو مادہ پر کسی قسم کا اثر ڈال سکے کیونکہ مادہ بذاتِ خود اس کائنات کی علتِ اولیٰ ہے۔ اس طرزِ فکر سے یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ انسان اس کائنات کے وسیع و عریض کارخانہ میں ایک عارضی اور اتفاقی شے ہے جو مادہ کی اندھی قوتوں کی تخلیق اور اس کی کرشمہ سازیوں کا محض ایک غیر متعلق تماشائی ہے۔ اُس کی خواہشات اور تمنائیں خواہ کیسی ہی مقدس اور پاک ہوں، بہرحال ہیں مادی۔ اُس کے عزائم اور مقاصد خواہ کتنے ہی ارفع و اعلیٰ ہوں لیکن اُن کی تہ میں کارفرما قوت صرف مادی ہے۔ وہ غلطی سے اپنے آپ کو اس کائنات کا مرکز سمجھتا ہے لیکن یہ اس کی ابلہ فریبی ہے۔ اُس کی اصل حقیقت اس کائنات میں مادی قوتوں کے ہاتھ میں ایک بے بس کھلونے کی سی ہے۔ اُس کے افکار و تصورات، اُس کے اعمال و افعال سب مادہ ہی کے آفریدہ ہیں اور اس لیے اس کا مقدر بھی مادہ کی کارفرمائی پر منحصر ہوتا ہے۔ اس اندازِ فکر کا ایک بالکل قدرتی اثر جو انسانی زندگی پر مرتب ہوتا ہے وہ یہ کہ انسان کے فکر کی پرواز اور اُس کے عمل کی تگ و تاز صرف اس آب و گل کی حدبندیوں تک محدود ہو۔ اگر مادی حالات موافق نظر آئیں تو وہ پُر امید ہو کر چل پڑے لیکن اگر عالمِ اسباب اُس سے آنکھیں پھیرتا ہوا دکھائی دے تو فوراً مایوس ہو کر بیٹھ جائے۔

---

اس تصورِ حیات کے برعکس چونکہ ایک خدا پرست کائنات کے متعلق ایک بالکل دوسرے نقطۂ نظر کا حامل اور داعی ہے اس لیے مادی حالات اور دنیاوی اسباب و وسائل کے بارے میں بھی اُس کا طرزِ فکر ایک بے خدا شخص سے بالکل الگ اور جداگانہ ہے۔ اُسے یہ بات تو تسلیم ہے کہ اُس کے مادی وجود کا تانا بانا عناصرِ طبعی کے مجموعہ سے عبارت ہے لیکن وہ اسے ماننے کے لیے تیار نہیں کہ وہ بھی زمان و مکان کے تقیدات کا اسی طرح پابند ہے جس طرح کہ جمادات اور نباتات ہیں۔ شعور و آگہی کی نعمت سے سرفراز ہونے کے بعد وہ کبھی اس چیز کو باور نہیں کر سکتا کہ یہ کائنات صرف مادی اسباب و مؤثرات کا وسیع اور پیچیدہ طلسم ہے اور اس نظامِ تکوینی کے پرے کوئی ایسی ذات

نہیں جس کی منصوبہ بندی کی یہ ساری کائنات رہینِ منت ہے۔ وہ اپنے اردگرد پھیلی ہوئی مادی دنیا کو سمجھنے سے کہیں زیادہ اس حقیقتِ کبریٰ کا کھوج لگانے کے لیے بے قرار رہتا ہے جس کو جاننے اور ماننے بغیر اس کا اپنا وجود ہستی کی وسعتوں میں بے معنی ہے اور جس کے دیئے ہوئے ضابطۂ حیات کو اپنائے بغیر اس کی ذات کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ وہ اس نظریہ کو یکسر باطل سمجھتا ہے کہ فطرت کی ساری زنگارنگی محض بخت و اتفاق سے طبیعی اور کیمیاوی قوتوں کے عمل سے معرضِ وجود میں آگئی ہے اور انسانی شعور سے اس کا تعلق اور ربط محض اتفاقی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک اس کائنات کی قدر و قیمت میں ایک حقیقت ہے جس کا ماخذ و منبع ذاتِ باری ہے، جو اقدار کا سرچشمہ ہے۔ اور جس کی مشیت اس ساری کائنات پر حاوی ہے۔ یہ مظاہرِ قدرت نہ صرف اس کے وجود کی زندہ شہادت ہیں بلکہ اس کے ارادہ کے پابند بھی ہیں

---

اس تصورِ حیات کو اپنا لینے کے بعد انسان کے اندر اس غلط خیال کی خود بخود بیخ کنی ہو جاتی ہے کہ وہ مادی حالات و وسائل کے سامنے بے بس اور مجبور ہے اور اُس کا ماحول بالکل میکانکی طور پر اُسے بھیڑ بکریوں کے گلہ کی طرح جس طرف چاہے ہانک کر لے جا سکتا ہے۔ خالقِ کائنات پر ایمان اس کے اندر نہ صرف خود اعتمادی پیدا کرتا ہے بلکہ اُس کے دل و دماغ میں اس خیال کی بھی تخم ریزی کرتا ہے کہ وہ کائنات کا شاہکار اور اس کا مرکز و محور ہے۔ وہ اگرچہ رہتا تو مادی دنیا ہی میں ہے لیکن وہ خود کو اس کی جکڑ بندیوں کا اسیر اور غلام نہیں سمجھتا بلکہ ہمیشہ مشیتِ الٰہی کا پابند خیال کرتا ہے۔ وہ پھر مادی ماحول کے سامنے سپر ڈالنے کی بجائے اس کے خلاف صف آرا ہوتا ہے اور اُن موانع پر قابو پانے اور تسخیر کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس پر طبیعی قوانین نے عائد کیے ہیں اور اس طرح اس آب و گل کی دنیا میں اپنے مالک کے منشا اور رضا کے مطابق تصرف کرنا سیکھتا ہے۔ اس طرزِ عمل سے وہ نہ صرف کائنات کی دوسری منفعل ہستیوں سے سربلند اور ممتاز ہوتا ہے بلکہ اپنے آپ کو صحیح معنوں میں اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق ٹھہراتا ہے۔ اس کے اندر خود بخود ایک شانِ استغنا پیدا ہوتی ہے جو اُسے پیمانۂ امروز و فردا سے بے نیاز بنا دیتی ہے۔ اب اُس کے فکر و عمل کی جولانگاہ حواس اور حیات

کی دنیا نہیں رہتی بلکہ اُس کی زد میں وہ مقامات بھی آجاتے ہیں جنھیں لوگ عام طور پر ماورائے سرحدِ ادراک سے تعبیر کرتے ہیں۔ زمان و مکان پھر اُس کے مالک اور مختار بننے کی بجائے اُس کے حلقہ بگوش بن جاتے ہیں اور دورِ آفاق اپنی رفتار کے پیچ و خم کو اُسی کے اشارۂ ابرو کے مطابق متعین کرتا ہے۔

---

جس شخص کی نظر اسباب کی بجائے مسبب الاسباب پر ہو اور جو اس بدیہی حقیقت کو دل و جان سے قبول کرے کہ کائنات میں جو کچھ موجود ہے وہ سب اُسی ایک ذات کی کرشمہ سازی ہے، اور اُسی ایک کا ارادہ اور اختیار سب پر حاوی ہے، تو وہ بالکل فطری طور پر دنیا کے مال و متاع کو وہ اہمیت نہیں دیتا جو ایک دنیا پرست دیتا ہے۔ اس لیے وہ مادّی حالات کی موافقت یا نامساعدت دیکھنے کی بجائے اِس بات کو معلوم کرنے کی فکر کرتا ہے کہ کیا اُس کا خالق و مالک اُس سے راضی ہے یا نہیں۔ جب اُسے ایک بار اس امر کا یقین ہو جائے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کی رضا اور منشا کو پورا کر رہا ہے، تو پھر نہ تو وسائل و اسباب کی کمی اس کے حوصلوں کو پست کرتی ہے اور نہ مخالفتوں کا سیلاب ہی اُس کے ارادوں کو شل کرتا ہے۔ وہ دنیا کی اس رزم گاہ میں بے تیغ بھی لڑ جانے کی جرأت رکھتا ہے، وہ بڑے بڑے جباروں اور قہاروں کے مقابلے میں اس بیباکی سے اترتا ہے جیسے کہ اُن کی حیثیت اس کے نزدیک پرِ کاہ کے برابر بھی نہیں، وہ آگ کے الاؤ میں اس اعتماد کے ساتھ کودتا ہے کہ خود اس کی اپنی عقل بھی اُس کی اس جسارت پر حیران و ششدر رہ جاتی ہے، وہ بڑے بڑے ہولناک حالات میں گھر کر بھی اس طرح پُرسکون اور مطمئن رہتا ہے گویا کہ اُس کے سامنے کچھ ہے ہی نہیں۔ اُس کی راہ میں نہ تو صحراؤں کی وسعتیں حائل ہوتی ہیں، نہ پہاڑوں کی بلندیاں۔ وہ سمندر کی موجوں سے بڑی بے پروائی کے ساتھ کھیلتا ہے۔ غور کیجیے کہ آخر اس جرأتِ رندانہ، اس زبردست اعتماد اور اس لازوال اطمینان کی وجہ بجز اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اس راز سے پوری طرح آشنا ہے کہ یہ سب چیزیں اُس کے آقا کے اُسی طرح اختیار میں ہیں جس طرح کہ خود اُس کی اپنی جان ہے۔ وہ جب چاہتا ہے چشم زدن میں سمندر کا سینہ چاک کر دیتا ہے۔ وہ بڑے بڑے لشکروں کو ٹڈیوں کے غول بھیج کر تباہ کروا دیتا ہے اور جب ارادہ کرتا ہے

تو صنم خانوں سے کعبہ کے پاسباں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ دنیا کے سارے اسباب و وسائل تنہا اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور ان سب پر اُسی کا حکم چلتا ہے۔ اس لیے ایک مسلمان کو ماحول کی سازگاری دیکھنے کی بجائے اپنے مالک کو راضی کرنے کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ وہ اگر راضی ہے تو پھر سارے جہاں کی مخالفت بھی اُس کا بال تک بیکا نہیں کر سکتی اور اگر وہ ناراض ہے تو پھر اس دنیا کے سارے اسباب اُس کے کسی کام نہیں آسکتے بلکہ اُس کے لیے مضر اور نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہی وہ اصل وجہ ہے کہ ایک مسلمان مال و متاع جمع کرنے کی بجائے اپنے مالک کی رضا ڈھونڈتا ہے اور انتہائی ناسازگار حالات میں بھی یاس و قنوط میں مبتلا ہونے نہیں پاتا۔

آئیے اب یہ دیکھیں کہ قرآنِ پاک اس حقیقت کو کس طرح ذہن نشین کراتا ہے:

اس نقطۂ نظر سے اگر تعلیماتِ الٰہی کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُس نے ذہنِ انسانی میں اس تصور کی آبیاری کرنے کے لیے مختلف انداز اختیار کیے ہیں۔

وہ سب سے پہلے ایجابی طور پر انسان کے دل میں اس خیال کو راسخ کرتا ہے کہ اس کائنات کو پیدا کرنے والا پروردگارِ عالم ہے اور یہاں صرف اسی کا حکم چلتا ہے۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (الاعراف۔ رکوع ۷)

درحقیقت تمہارا رب وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ پھر اپنے تختِ سلطنت پر متمکن ہوا۔ جو رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے جس نے سورج اور چاند اور تارے پیدا کیے۔ سب اس کے فرمان کے تابع ہیں۔ خبردار رہو، اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر۔

اَلَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ

وہ ذات جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور جس نے نہ تو کسی کو بیٹا بنایا ہے اور نہ اس کی

| | |
|---|---|
| شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا ۝ (الفرقان - ۱) | سلطنت میں کوئی اس کا شریک ہے۔ اُس نے ہر شے کو پیدا کیا ہے اور پھر اُس کے لیے ایک اندازہ ٹھیرا دیا ہے۔ |
| مَا لَهُمْ مِنْ دُونِهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا (الکہف - ۴) | اُس کے سوا بندوں کا کوئی ولی و سرپرست نہیں اور نہ وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک کرتا ہے۔ |
| فَالْحُكْمُ لِلَّهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيرِ هُوَ الَّذِي يُرِيكُمْ آيَاتِهِ وَيُنَزِّلُ لَكُمْ مِنَ السَّمَاءِ رِزْقًا۔ | حکم اسی اللہ کا ہے جو بزرگ و برتر ہے۔ وہی تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے اور تمہارے لیے آسمان سے رزق اتارتا ہے۔ |
| لَهُ مُلْكُ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ۔ (الزمر - ۵) | آسمان و زمین کی بادشاہت اسی کی ہے، پھر اسی کی طرف تم پلٹائے جاؤ گے۔ |

یہ سب آیات اس حقیقت کی آئینہ دار ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کا صرف خالق ہی نہیں بلکہ آمر اور حاکم بھی ہے۔ اُسی کا حکم اس کائنات کے گوشے گوشے میں چلتا ہے اور اُسی کی مشیت اور ارادہ کے تحت یہاں سب کچھ ہو رہا ہے۔

---

اس بات کو ذہن نشین کرانے کے بعد کہ اس دنیا میں صرف خالقِ کائنات ہی ہر چیز کا مالک و مختار ہے اور اسی کا حکم سب پر حاوی ہے، قرآن پاک اپنے ماننے والوں سے اس چیز کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں صرف اُسی ذات پر اعتماد اور بھروسا کریں۔ جب ہم اس معاملہ پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ مطالبہ دراصل اللہ پر ایمان کا بالکل قدرتی نتیجہ ہے۔ جب ایک شخص یہ مان لے کہ اس کا خالق اور مالک اللہ تعالیٰ ہے اور اُس کے قبضۂ قدرت میں زندگی کی ہر چھوٹی بڑی چیز ہے تو اس کے اس ایقان کا بالکل قدرتی تقاضا یہ ہے کہ وہ تنہا اسی ایک ذات پر توکل کرے چنانچہ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اس چیز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

| | |
|---|---|
| وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ (فرقان ۵) | اسی زندہ ہستی پر بھروسا کر جس کو موت آنے والی نہیں ہے۔ |

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ - اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ - (آلِ عمران - ۱۷)

جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسا کرو۔ اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اسی کے بھروسے پر کام کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں اور وہ تمہیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکتا ہو۔ پس اہلِ ایمان کو اللہ ہی پر بھروسا رکھنا چاہیے۔

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ

جو اللہ پر بھروسا کرے گا تو وہ اُس کو کافی ہو گا۔

نبی اکرم سے جو دعائیں مروی ہیں وہ بھی اس حقیقت کی شاہد ہیں کہ حضور ذات باری تعالیٰ پر بھروسے اور اعتماد کو ایمان کا جزوِ لاینفک سمجھتے تھے۔ سرکار دو عالم کی لاتعداد دعائیں انہیں احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں:

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ان رسول اللّٰہ کان یقول - اللّٰھم لک اسلمت وبک اٰمنت وعلیک توکلت والیک انبت والیک خاصمت، اللّٰھم اعوذ بعزتک لا الٰہ الا انت ان تضلنی، انت الحی الذی لا تموت، والجن والانس یموتون۔

اے اللہ! میں نے تیرے ہی سامنے سر جھکایا اور تجھی پر ایمان لایا اور تیرے ہی اوپر بھروسا کیا اور تیری ہی طرف رجوع کیا اور تیری ہی خاطر جھگڑا کیا۔ اے اللہ میں تیری عزت کی پناہ چاہتا ہوں، کوئی معبود تیرے سوا نہیں، تو مجھے بھٹکا نہ چھوڑ دے تو زندہ ہے کبھی نہ مرے گا، جن اور انسان سب مر جائیں گے۔

اسی طرح سونے کے وقت کی دعا بھی اسی قسم کے جذبات سے لبریز ہے:

حضرت براء بن عازب سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اپنے بستر پر آؤ تو کہو۔

اللّٰھم اسلمت نفسی الیک ووجھت وجھی الیک، وفوضت امری الیک والجأت ظھری الیک رغبۃ ورھبۃ الیک

اے اللہ: میں نے اپنے آپ کو تیرے حوالہ کر دیا، اور اپنا رُخ تیری طرف موڑ لیا، اور اپنا معاملہ تیرے سپرد کیا، اور اپنی پیٹھ تیرے سہارے لگا دی، میری رغبت

# تفسیر سورۂ فاتحہ

(مولانا عبدالحی فاروقی صدر شعبۂ اسلامیات اسلامیہ کالج، لاہور)

(رکوع ۱، آیات ۷)

**قرآن کی تقسیم** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن پاک آہستہ آہستہ ضرورت کے مطابق نازل ہوتا رہا، اور اس کی تکمیل میں پورے ۲۳ سال لگ گئے، نبوت مل جانے کے بعد آپ ۱۳ سال تک مکہ ہی میں مقیم رہے، قرآن کریم کا بڑا حصہ اسی زمانے میں اترا، پھر جب آپ حالات سے مجبور ہو کر مدینہ منورہ ہجرت فرما گئے تو باقی قرآن کا نزول وہاں ہوا جو دس سال میں پورا ہوا۔

آپ کی حیات مقدس کے دو نمایاں دور ہیں، اور دونوں کی خصوصیات و امتیازات اس درجہ ایک دوسرے سے الگ ہیں، کہ دونوں کے دو جداگانہ نام مقرر ہو گئے ہیں، ہجرت سے قبل کا زمانہ مکی کہلاتا ہے، اور دوسرا مدنی، اسی کے پیش نظر قرآن پاک کی تمام سورتوں کی تقسیم بھی اسی طرح کی گئی ہے۔ وہ تمام سورتیں جو قیام مکہ کے دوران میں اتریں، ان کو مکی کہا جاتا ہے، اور جو ہجرت کے بعد نازل ہوئیں وہ مدنی ہیں، خواہ وہ حدیبیہ کے میدان میں اتری ہوں، کسی جنگ میں الہام ہوئی ہوں، یا حجۃ الوداع میں نازل ہوئیں، جمہور کا یہی مذہب ہے، اس لحاظ سے مکی سورتوں کی تعداد ۸۶ ہے اور ۲۸ مدنی ہیں، گویا کل ۱۱۴ سورتیں تمام قرآن میں ہیں۔

**دونوں کی خصوصیات** مکی اور مدنی سورتوں میں جو فرق ہے وہ ہر پڑھنے والے پر فوراً ظاہر ہو جاتا ہے ملاحظہ کیجیے:

## مکی سورتیں

۱- ان میں زیادہ تر جذبات کا لحاظ کیا گیا ہے۔

۲- دعوت و تبلیغ اسلام پر زور ہے، طرز خطاب میں نرمی اور ملاطفت پیش نظر ہے، اور جہاد کا ذکر

نہیں۔

۳۔ فواصل کا لحاظ رکھا گیا ہے اور وہ بھی چھوٹے چھوٹے۔

۴۔ الفاظ پُر عظمت اور پُر شکوہ ہیں۔

۵۔ توحید، قیامت اور عبرت و موعظت پر مشتمل ہیں۔

۶۔ اعمال و عبادات کا مطالبہ بہت کم ہے، زیادہ تر عقائد سے بحث کی گئی ہے۔

۷۔ یہود و نصاریٰ سے کوئی جھگڑا نہیں۔

۸۔ چھوٹی چھوٹی آیتیں اور چھوٹی چھوٹی سورتیں ہیں۔

۹۔ یا ایہا الناس کے لفظ سے خطاب کیا جاتا ہے، یا ایہا الذین آمنوا کا لفظ کہیں نظر نہیں آتا۔

## مدنی سورتیں

۱۔ خیالات میں گہرائی اور عمق ہے۔

۲۔ نشر و اشاعتِ اسلام کے ساتھ ساتھ جہاد کا بھی حکم ہے۔

۳۔ فواصل کی طرف توجہ نہیں کی گئی اور جو ہیں تو وہ بڑے بڑے۔

۴۔ قانونی الفاظ ہیں۔

۵۔ احکام اور قوانین ہیں۔

۶۔ اعمال اور عبادات کا سب سے زیادہ مطالبہ ہے

۷۔ اہلِ کتاب سے باقاعدہ مناظرہ ہے

۸۔ بڑی بڑی آیتیں اور بڑی بڑی سورتیں ہیں۔

۹۔ لوگوں کو عام طور پر یا ایہا الذین آمنوا سے خطاب کیا جاتا ہے یا ایہا الناس کا لفظ بہت کم آتا ہے۔ صرف سات آیتیں ایسی ہیں جن میں یا ایہا الناس سے خطاب کیا گیا ہے اور وہ یہ ہیں:۔

(۱) یَا اَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ (۲ : ۲۱)

(۲) یَا اَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا (۲ : ۱۶۸)

(۳) يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ (۴ : ۱)

(۴) إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ أَيُّهَا النَّاسُ (۴ : ۱۳۳)

(۵) يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ مِنْ رَبِّكُمْ (۴ : ۱۷۰)

(۶) يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّكُمْ - (۴ : ۱۷۵)

(۷) يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى (۴۹ : ۱۳)

اسی فرق کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یوں بیان فرماتی ہیں:

انما نزل اول ما نزل منه سورة من المفصل فيها ذكر الجنة والنار حتى اذا ثاب الناس الى الاسلام، ثم نزل الحلال والحرام، ولو نزل اول شيء لا تشربوا الخمر لقالوا لا ندع الخمر ابداً، ولو نزل لا تزنوا لقالوا لا ندع الزنا ابداً، لقد نزل بمكة وانا جارية العب بل الساعة موعدهم والساعة ادهى وامر، وما نزلت سورة البقرة والنساء الا وانا عنده (بخاری)

ابتدا میں سُوَرِ مفصل نازل ہوئیں، جن میں جنت اور دوزخ کا ذکر تھا، یہاں تک کہ لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ پھر (احکام) حلال و حرام کا نزول شروع ہوا۔ اگر شروع ہی سے یہ حکم نازل ہوتا کہ شراب نہ پیو تو لوگ کہتے ہم کبھی شراب نہیں چھوڑیں گے اور اگر یہ (حکم) نازل کیا جاتا کہ زنا نہ کرو تو کہہ دیتے کہ ہم کبھی زنا نہیں چھوڑیں گے جب یہ (آیت) نازل ہوئی بل الساعة موعدهم والساعة ادهى وامر، تو میں اس وقت ابھی کھیلنے کودنے والی بچی تھی اور سورۂ بقرہ و نساء کا نزول اس وقت ہوا جب میں خود ان (رسول اللہؐ) کے پاس موجود تھی۔

اس کی حکمت | مدنی سورتوں میں تدبیرِ منزل، سیاستِ مدن، اور خلافتِ کبریٰ کے احکام و ضوابط اور امت کی تشکیل و تنظیم کے اصول و قوانین پر بحث کی گئی ہے۔ اور مکی سورتوں میں توحید، قیامت، رسالت اور اخلاقِ فاضلہ پر زور دیا گیا ہے، یہ نمایاں امتیاز اس لیے ہے کہ اگر ابتدا ہی میں اہلِ عرب کو اعمالِ فاسقہ کو چھوڑنے اور مدنی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جاتا تو بہت کم لوگ اس صدا پر لبیک کہتے، اس لیے ان لوگوں کی اصلاح و تہذیب کے لیے یہ حکیمانہ صورت اختیار کی گئی، کہ شروع میں انہیں جزائے اعمال کی طرف توجہ

دلائی گئی اور یہ بتا دیا گیا کہ ایک ایسی قوتِ قاہرہ بھی موجود ہے جو تمہارے ایک ایک عملِ حیات کو گہری نظر سے دیکھ رہی ہے، وہ تمہارے کسی کام کو ضائع نہیں ہونے دے گی، تمہیں اس کا بدلہ ضرور مل کر رہے گا اور اس وقت کوئی بڑی سے بڑی قوت بھی تمہاری مدد نہ کر سکے گی، بلکہ ہر شخص اپنے اعمال کا آپ ذمہ دار اور جواب دہ ہو گا۔

**رسول کی ضرورت** جب ایک شخص خدا کے وجود اور اپنی ذمہ داری و مسئولیت کو دل کے ساتھ یقین کر لے تو اب وہ خود بخود اس امر کی ضرورت محسوس کرے گا کہ اسے اخلاقِ فاضلہ اور جرائم کا علم ہو تاکہ وہ معصیت سے پرہیز کرکے نیکی کی راہ اختیار کر سکے، مگر خود انسان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ماحول سے متاثر ہو کر اپنی فطرتِ صالحہ کے صاف و شفاف آئینہ کو گرد آلود کر لیتا ہے، حجابِ طبع، حجابِ رسم، اور حجابِ سوءِ معرفت اس کے قلبِ سلیم کو بالکل تاریک و مظلم بنا دیتے ہیں، ظلمٰت بعضہا فوق بعض، اور وہ اس طرح راہِ حق سے منحرف ہو جاتا ہے۔ اس لیے قدم قدم پر اس کو ایک ہادی اور رہبر کی ضرورت ہے، جو اس کو نیکی اور بدی کی راہ دکھا دے اور راستہ کے تمام نشیب و فراز سمجھا دے، یہی وجہ ہے کہ ہر مسلم تا انت دن میں پانچ وقت اللہ کے حضور میں کھڑا ہو کر اھدنا الصراط المستقیم کی دعا مانگتا ہے۔

قرآن حکیم نے فطری طریقِ تعلیم اختیار کیا، جب خدا کے وجود، اور اپنی ذمہ داری کو وہ لوگ سمجھ گئے تو انھیں بتایا گیا کہ اس اللہ کے ساتھ رشتہ قائم کرنے کے لیے وہ اپنا رسول بھیجتا ہے، اس کے پاس اس کے احکام و فرامین ہوتے ہیں، تمہارا فرض ہے کہ اس کا اتباع کرو تاکہ راہِ حق پا سکو۔

| | |
|---|---|
| فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًى، فَمَنْ تَبِعَ | جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے تو |
| هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ | اس کی پیروی کرو، تو جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی |
| وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا، اُولٰٓئِكَ | کی، ان کو نہ کچھ خوف ہو گا اور نہ وہ غمناک ہوں گے، |
| اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ | اور جنہوں نے اس کو قبول نہ کیا اور ہماری آیتوں کو |
| (۲: ۳۸: ۳۹) | جھٹلایا وہ دوزخ میں جانے والے ہیں اور وہ اس میں |

ہمیشہ رہیں گے۔

**قلب القرآن** اگر آپ مکی سورتوں کو مدنی حصہ سے الگ کر لیں تو آپ پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ ان سورتوں میں زیادہ تر توحید، رسالت اور جزائے اعمال پر زور دیا گیا ہے، اگر اعمال کی طرف توجہ کی گئی ہے تو بہت کم، اس لیے کہ عمل نتیجہ ہے، عقائد صالحہ اور یقین واذعان کا، جب تک ایک خیال آپ کے دل میں مستحکم و استوار نہ ہو گا اس سے داعیۂ عمل کے پیدا ہونے کی کوئی صورت نہیں، اس لیے عملاً قانونی زندگی مدینہ منورہ ہی سے شروع ہوتی ہے۔

دنیا میں جس قدر انبیاء و رسل مبعوث ہوئے، ان سب میں اصول و کلیات کے اعتبار سے ذرہ برابر بھی فرق نہیں، سب کے سب انہیں عقائد و یقینیات کی دعوت دیتے ہیں، جن پر تمام مذاہب و ادیان متفق ہیں، اور وہ یہی توحید، رسالت اور قیامت ہیں، یہی وجہ ہے کہ سورۂ یٰسین کو حدیث میں قلب القرآن کہا گیا ہے کیونکہ اس میں ان ہی اہمات مسائل پر بحث کی گئی ہے، سورۂ اخلاص میں صرف توحید کا ذکر تھا، اس لیے لسان نبوت نے اس کو ثلث قرآن فرمایا۔

**ترتیبِ نزول** علمائے تفسیر اس امر میں مختلف الرائے ہیں کہ سب سے پہلے کونسی سورت نازل ہوئی ہے، ایک خیال یہ ہے کہ ناموسِ الٰہی نے اولین مرتبہ جب رسول اللہ کو مخاطب کیا تو کہا: اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ. خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔ ان کے نزدیک پہلا الہام ان پانچ آیتوں کا ہوا، اور اس کے بعد کچھ دیر کے لیے وحی رک گئی۔

دوسرے حضرات یوں فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئی ہیں، يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ، قُمْ فَأَنْذِرْ، وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ، وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ، وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ، وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ، وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (۷۴ : ۱ تا ۷)۔ ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ اولیت کا شرف سورۂ فاتحہ کو حاصل ہے۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ تینوں قول اپنی اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک ہیں، اور باریک بین نظر سے دیکھا جائے تو کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا، اور ہر ایک کی صحت واضح ہو جاتی ہے۔

**جداگانہ حالات** اصل بات یہ ہے کہ حالات و واقعات کی جداگانہ نوعیت کو پیش نظر رکھنا چاہیے سب سے پہلے خود صاحبِ الہام کو اس امر کے لیے تیار کرنا ہے کہ اس سے رشد و ہدایتِ عالم کا اہم و اعظم کام لیا جانے والا ہے، وہ اس بارِ گراں کو محتمل ہونے کو تیار رہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جب وادئ طُویٰ میں سے گذر ہوا، اور انہوں نے دُور سے آگ دیکھی تو اپنے اہل و عیال کو چھوڑ کر آگ لینے کے لیے درخت کے پاس گئے وہاں انھیں یوں مخاطب کیا گیا:

إِنِّيٓ أَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى وَأَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحَىٰ، إِنَّنِيٓ أَنَا اللَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّآ أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلَوٰةَ لِذِكْرِيٓ۔ (۲۰: ۱۲ تا ۱۴)

میں تو تمہارا پروردگار ہوں تو اپنی جوتیاں اتار دے، تو یہاں پاک میدانِ طُویٰ میں ہے، اور میں نے تجھ کو انتخاب کر لیا ہے، تو جو حکم دیا جائے اسے سُن بے شک میں ہی خدا ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، تو میری عبادت کیا کر، اور میری یاد کے لیے نماز پڑھا کر۔

جب نبی کو اطلاع مل گئی کہ وہ خدائے قدوس کی طرف سے مبعوث فرمایا گیا ہے، تو اب اسے یہ بتایا جاتا ہے کہ اسے اپنی تمام زندگی کس اہم و اقدم فرض میں صرف کرنی ہوگی۔ اس کے تمام معمولات و اوقات کس کام کی تعمیل و تکمیل میں خرچ ہوں گے، اور کس قدر صبر و استقامت سے کام لینا پڑے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا۔

اِذْهَبَآ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُۥ طَغَىٰ فَقُولَا لَهُۥ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُۥ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ (۲۰: ۴۳، ۴۴)

دونوں فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ سرکش ہو رہا ہے اور اس سے نرمی سے بات کرنا شاید وہ غور کرے یا ڈر جائے۔

لیکن ابھی تک اس کے سامنے کوئی مدوّن و مرتب قانون اور دستور العمل نہیں ہے جس کی طرف دعوت دے، اب اسے پہلی مرتبہ وہ سبق پڑھایا جاتا ہے جو تمام گندگیوں اور ناپاکیوں کو دور کرنے والا۔ ہر روگ اور بیماری کا بہترین مداوا، درماندگیوں، ذلتوں اور رسوائیوں سے نجات دینے والا، اور فلاح و کامرانی کا ذمہ دار و کفیل ہے، جس پر عمل کر کے خوف اور ڈر سے نجات مل جاتی ہے:

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔

جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے تو اس کی پیروی کرنا، کہ جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غم ناک ہوں گے۔

**تطبیق کی راہ** | اس تفصیل کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ جن اربابِ فضل وکمال نے سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیتوں کو اولین وحی قرار دیا تو ان کا مطلب یہ تھا کہ ہدایتِ عالم کے فرضِ جلیل پر فائز ہونے کی اطلاع سب سے پہلے سورۂ علق ہی میں دی گئی، اور جن بزرگانِ ملت نے دوسری جہت پر نظر کی تو ان کا یہ ارشاد بالکل صحیح ہے کہ انذار وتبلیغ کا سب سے پہلا حکم اسی سورۂ مدثر ہی میں دیا گیا، لیکن اگر یہ دریافت کیا جائے کہ سب سے پہلے کونسی سورۃ پوری کی پوری اتری، جو ایک مدون ومرتب قانون ودستور العمل کی حیثیت رکھتی ہے تو سب کا فیصلہ یہی ہوگا کہ اس لحاظ سے صرف سورۂ فاتحہ ہی وہ سورۃ ہے جو سب سے پہلے نازل کی گئی۔

**سورت کا نام** | یہ تو آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ قرآن کریم کی تمام سورتوں کی تعداد ۱۱۴ ہے۔ ہر سورت کا نام اس کی کسی نہ کسی خصوصیت کو پیشِ نظر رکھ کر مقرر کیا گیا ہے بعض ایسی سورتیں بھی ہیں جن کے ایک سے زیادہ نام ہیں، سورۂ فاتحہ اس لحاظ سے ان سب پر فوقیت رکھتی ہے۔ صاحبِ روح المعانی کے بیان کے مطابق اس کے ۲۰ سے زائد نام ہیں، بعض کی تفصیل ملاحظہ ہو:

۱۔ فاتحۃ الکتاب، اس سے قرآن کریم کی ابتدا ہوتی ہے۔

۲۔ فاتحۃ القرآن،

۳۔ ام الکتاب، عربی زبان میں اُم ایسی چیزوں کے لیے بولا جاتا ہے جو اپنے اندر جامعیت رکھتی ہوں، فوج کے جھنڈے کو اُم کہتے ہیں کیوں کہ فوج اس کے پیچھے جمع ہوتی ہے، مکہ مبارکہ کا نام ام القریٰ بھی ہے، اس لیے کہ حج کے موسم میں عرب کے تمام شعوب وقبائل وہاں جمع ہوتے تھے۔

۴۔ الراس، مرکزِ دماغ کو کہتے ہیں، قرآن کریم میں جس قدر مطالب تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں ان کو اجمالاً اس سورت میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس بنا پر یہ ام القرآن ہے۔

۵۔ الکنز

۶۔ الوافیہ

۷۔ الکافیہ، اگر ایک شخص نماز میں اس سورت کو پڑھے اور کچھ نہ پڑھے تو بھی یہ کافی ہو جائے گی۔

۸۔ اساس القرآن، یہ اجمال ہے، اور قرآن اس کی تفصیل۔

۹۔ الحمد،

۱۰۔ الشکر،

۱۱۔ الدعا،

۱۲۔ تعلیم المسئلہ

۱۳۔ السؤال

۱۴۔ المناجاۃ

۱۵۔ التفویض، انسان جب اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کہتا ہے تو وہ خدائے قدوس سے سرگوشی کرتا ہے، اور اپنے آپ کو اس کی تفویض میں دے دیتا ہے۔

۱۶۔ الرقیہ،

۱۷۔ الشفاء،

۱۸۔ الشافیہ

۱۹۔ الصلوٰۃ، اس لیے کہ اس کے بغیر نماز ہی نہیں ہوتی: لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب، جو شخص سورۂ فاتحہ نہیں پڑھتا اس کی نماز ہی نہیں ہوتی، قرآن کریم کی کسی سورت کی اگر دو چار آیتیں بھی آپ پڑھ لیں تو نماز ہو جائے گی مگر اس سورت کے آپ ٹکڑے نہیں کر سکتے، بلکہ پوری کی پوری پڑھنی ہوگی

۲۰۔ نور، مومن کے دل میں نور پیدا کرتی ہے،

۲۱۔ القرآن العظیم، وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ، (۱۵: ۸۷) یہ واقعہ ہے کہ ہم نے تمہیں سات دہرائی جانے والی چیز عطا فرمائی ہے، اور قرآن عظیم۔

۲۲۔ السبع المثانی، اس سورت کی سات آیتیں ہیں جو بار بار دہرائی جاتی ہیں، نماز کی ہر رکعت میں اس کا پڑھنا ضروری ہے، بعض روایات میں اس کو اعظم سورۃ فی القرآن اور آخر سورۃ فی القرآن بھی کہا گیا ہے۔

ناموں کی یہ تفصیل آپ کے سامنے ہے۔ کیا آپ بتلا سکتے ہیں کہ اتنے نام کسی اور سورت کے بھی ہیں، ناموں کی یہ کثرت ہمیں ایک طرف تو یہ بتاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اس چھوٹی سی سورت کو کس قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، دوسری جانب اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حقیقت میں قرآن کریم کے تمام مطالب پر اجمالاً حاوی ہے،

اجمال کی تفصیل | قریباً تمام مفسرین نے اس اجمال کی تفصیل بیان کی ہے، صاحب روح المعانی لکھتے ہیں:

| | |
|---|---|
| انها مشتملة على اربعة انواع من العلوم التي هي مناط الدين (الاول) علم الاصول ومعاقده معرفة الله تعالى وصفاته واليها الاشارة بقوله رب العٰلمين الرحمٰن الرحيم ومعرفة النبوة وهي المراد بقوله تعالى انعمت عليهم و المعاد الموعى اليه بقوله تعالى مالك يوم الدين (الثاني) علم الفروع اُسُّه العبادة وهو المراد بقوله اياك نعبد وهي بدنية و مالية، وهما مفتقران الى امور المعاش من المعاملات والمناكحات، ولابد، لها من الحكومات، فتمهدت الفروع على الاصول | وہ علوم جو دین کی اصل و اساس ہیں وہ چار ہیں، اور یہ سورت ان چاروں پر حاوی ہے (۱) علم اصول اللہ تعالیٰ کے صفات و مختصات کی پہچان، الحمد للہ رب العٰلمین الرحمٰن الرحیم میں اسی طرف اشارہ ہے، نبوت کی شناخت کے لیے صراط الذین انعمت علیہم ہے اور مالک یوم الدین کا اشارہ قیامت کی طرف ہے (۲) علم فروع۔ اس کی اصل و اساس عبادت ہے، ایاک نعبد سے یہی مراد ہے۔ عبادت بدنی بھی ہوتی ہے اور مالی بھی، اسی ذیل میں معاملات آجاتے ہیں جس میں معیشت، مناکحت اور حکومتیں آجاتی ہیں (۳) علم الاخلاق، جس سے کمالِ انسانیت حاصل ہوتا ہے، وصول الی اللہ کا یہی واحد ذریعہ ہے |

(۳) الثالث: علم ما به يحصل الكمال، وهو علم الاخلاق واجلاء الوصول الى الحضرة الصمدانية والسلوك لطريقة الاستقامة في منازل هاتيك الرتب العلية، واليه الاشارة بقوله اياك نستعين، اهدنا الصراط المستقيم (الرابع) علم القصص، والاخبار عن الامم السالفة السعداء والاشقياء، وما يتصل بهما من الوعد والوعيد، وهو المراد بقوله تعالى انعمت عليهم، غير المغضوب عليهم ولا الضالين

اسی سے استقامت نصیب ہوتی ہے، جس کا نتیجہ منازل علیہ کا کسب حصول ہے۔ ایاک نستعین، اھدنا الصراط المستقیم اسی طرف مُشیر ہے (۴) علم القصص گذشتہ امتوں کے واقعات، شقی وسعید کے واردات، پھر اس ذیل میں ترغیب و ترہیب ..... وعید وغیرہ، صراط الذین انعمت علیہم غیر المغضوب علیہم و الضالین میں اسی کا اجمالاً ذکر ہے۔

(ص۳ ج اول) المطبعة الكبرى الاميرية مصر ۱۳۰۱ھ

شاہ ولی اللہ لیکن اس مطلب کو جس لطیف و دل آویز انداز میں حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے اپنی مشہور کتاب الفوز الکبیر میں بیان کیا ہے وہ نہایت ہی اطمینان بخش معنی خیز اور حقائق مستورہ کو بے حجاب کرنے والا ہے، آپ فرماتے ہیں۔

”باید دانست کہ معانی منظومۂ قرآن خارج از پنج علم نیست۔ (۱) علم احکام از واجب و مندوب و مباح و مکروہ و حرام: خواہ از قسم عبادات باشد، یا تدبیر منزل یا سیاست مدینہ، و تفصیل ایں علم بذمہ فقیہ است، (۲) و علم مخاصمہ با چہار فرقۂ ضالہ، یہود و نصاریٰ و مشرکین و منافقین، و تفریع بریں علم بذمہ متکلم است (۳) و علم تذکیر بآلاء اللہ، از بیان خلق آسمان و زمین و الہام بندگان بانچہ ایشاں را در کار بایست، و از بیان صفات کاملہ او تبارک و تعالیٰ۔ (۴) و علم تذکیر بایام اللہ یعنی بیان وقائع کہ آں را خدائے تعالیٰ ایجاد فرمودہ است از جنس انعام مطیعین، و تعذیب مجرمین (۵) و علم تذکیر بموت و مابعد آں از حشر و نشر و حساب و میزان و جنت و نار، و حفظ تفاصیل ایں علوم و الحاق احادیث و آثار مناسبۂ آں وظیفہ واعظ و مذکر است

**سات آیات** آپ نے ابھی اوپر پڑھا ہے کہ قرآن پاک نے اس کو سات دہرائی جانے والی سورت کہا ہے، اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سورۂ فاتحہ کی آیت ہے یا نہیں۔ بعض صحابہ اس کو سورت کا جز قرار دیتے ہیں، امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی مذہب ہے، مگر جمہور صحابہ کی رائے یہ ہے کہ صرف یمن و برکت کے خیال سے اس کو سورۂ فاتحہ کے شروع میں لکھ دیا گیا ہے۔ ورنہ یہ اس کا حصہ نہیں، ہر سورت کے شروع میں اس کو اس لیے لکھا جاتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ایک سورت ختم ہو گئی اور دوسری کا آغاز ہوا۔ البتہ یہ بالکل واضح ہے کہ سورۂ نمل کی یہ آیت ضرور ہے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہری نماز میں بسم اللہ کو بلند آواز سے کبھی نہیں پڑھا۔ یہاں تک کہ آپ کی وفات ہوگئی، حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسولؐ اللہ، ابوبکرؓ، عمرؓ، اور عثمان رضی اللہ عنہم کے پیچھے نماز پڑھی تھی، ان میں سے کوئی بھی بسم اللہ کو بلند آواز سے نہیں پڑھتا تھا۔ عبداللہ بن المغفل کہتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ نماز میں بلند آواز کے ساتھ بسم اللہ پڑھ رہا تھا، میرے والد نے سن کر کہا یہ کیسی بدایت ہے؟ میں نے رسول اللہ، ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کے پیچھے نماز پڑھی ہے۔ وہ اپنی قرأت الحمد للہ رب العٰلمین سے شروع کیا کرتے تھے، جب تم نماز شروع کرو تو الحمد للہ رب العٰلمین سے کرو۔ طبرانی میں ایک روایت اس طرح آتی ہے کہ رسولؐ اللہ، ابوبکرؓ، عمرؓ عثمانؓ اور علیؓ آہستہ سے بسم اللہ پڑھا کرتے تھے، مسلم کی حسب ذیل روایت اس پر مزید روشنی ڈالتی ہے،

عن ابی ھریرۃ قال سمعت رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم یقول، قال اللہ تعالیٰ
قسمت الصلوٰۃ بینی و بین عبدی نصفین
ولعبدی ما سألنی فاذا قال الحمد للہ
رب العٰلمین، قال اللہ تعالیٰ حمدنی
عبدی و اذ قال الرحمٰن الرحیم، قال اثنیٰ
علی عبدی، و اذ قال مالک یوم الدین،

ابو ہریرہؓ کہتے ہیں، میں نے رسول اللہ کو یہ فرماتے
ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ یوں کہتا ہے، میرے درمیان
اور میرے بندے کے درمیان نماز آدھی ہے، اور
بندہ جو مانگے گا اسے مل جائے گا، جب اس نے الحمد للہ
رب العٰلمین کہا تو اللہ نے فرمایا میرے بندے نے میری
حمد کی۔ جب اس نے الرحمٰن الرحیم کہا، گویا اس نے
میری ثنا کی، جب اس نے مالک یوم الدین کہا تو

قال اللہ تعالیٰ مجّدنی عبدی، واذ قال ایاك نعبد وایاك نستعین، قال اللہ تعالیٰ ھٰذا بینی وبین عبدی، ولعبدی ماسأل، فاذا قال اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیہم غیر المغضوب علیہم ولا الضالین، قال ھٰذا العبدی ولعبدی ماسأل۔

اس نے میری بزرگی بیان کی اور جب اس نے یوں کہا ایاك نعبد وایاك نستعین، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کو وہ سب کچھ مل جائے گا جو وہ مانگتا ہے، اور جب اس نے اہدنا الصراط المستقیم، صراط الذین انعمت علیہم غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہا تو اللہ نے کہا، یہ میرے بندے کے لیے مخصوص ہے اور جو کچھ اس نے مانگا وہ سب دے دیا گیا۔

اگر بسم اللہ سورۂ فاتحہ کا جزو ہوتی تو اس کا سب سے پہلے اس روایت میں ذکر آتا، اس لیے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ گئی کہ یہ سورت کا حصہ نہیں ہے بلکہ محض برکت کے لیے ہر سورت کی ابتدا میں لکھی جاتی ہے، چنانچہ ثوری، ابن المبارک، ابن مسعود، ابن الزبیر، عمار بن یاسر، حسن بن ابی الحسین، شعبی، نخعی، قتادہ، عمر بن عبدالعزیز، اعمش، زہری، مجاہد اور احمد کی یہی رائے ہے، اور یہی حنفیہ کا مذہب ہے کہ وہ جہری نمازوں میں سورۂ فاتحہ کی قرأت الحمد للہ سے شروع کرتے ہیں۔

یہ تفصیل جو اوپر گذر چکی ہے، اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ سورۂ فاتحہ کی سات آیات یہ ہیں، (۱) الحمد للہ رب العالمین (۲) الرحمٰن الرحیم (۳) مالک یوم الدین (۴) ایاک نعبد وایاک نستعین (۵) اھدنا الصراط المستقیم (۶) صراط الذین انعمت علیہم (۷) غیر المغضوب علیہم ولا الضالین۔

**ہر کام کی ابتدا** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ جب کسی کام کو شروع کرتے تو بسم اللہ پڑھ لیتے، آپ نے فرمایا: کل ذی بال لم یبدأ به بسم اللہ الرحمٰن الرحیم فھو ابتر، اس کے پڑھ لینے سے دل میں یہ خیال برابر قائم رہتا ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں محض اس پروردگار کے لطفِ عمیم اور بے پایاں کرم کا نتیجہ ہے، ورنہ میں کیا اور میری بساط کیا۔

قرآن کریم کی ہر سورت کے شروع میں جو بسم اللہ لکھی گئی ہے اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے

کہ اس سورت میں جس قدر اوامر و نواہی اور آیات بینات ہیں ان کا نزول اللہ ہی کی طرف سے ہوا ہے کسی انسانی قوتِ فکر کا اس میں کوئی دخل نہیں، سورۂ علق کی ابتدا یوں ہوئی: اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ، یعنی آپ ان آیات کی تلاوت کیجیے اور یہ سمجھ لیجیے کہ خدائے قدوس کا یہ فضل مخصوص تھا جو اس نے آپ کو راہِ حق دکھا دی: وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ اب اس لازوال نعمت کا شکر یہ ہے کہ تمام اقوام و ملل میں اس کو پھیلا دیجیے کہ وہ اس قرآن کی بدولت دنیا و آخرت کی نعمتوں سے مالامال ہوں: وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ اور وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ وَأَنْ أَتْلُوَ الْقُرْآنَ، اسی طرف راہ نمائی کرتی ہیں۔

**حمد و ثنا** عربی زبان میں حمد کے معنی ثنائے جمیل کے ہیں: الثناء باللسان علی الجمیل الاختیاری یہ بالکل ظاہر بات ہے کہ صفتیں دونوں قسم کی ہو سکتی ہیں، اچھی بھی، اور بری بھی، حمد صرف ان صفات کے لیے مخصوص ہے جو اچھی ہوں، مدح بھی ثنا کے معنی میں آتا ہے مگر دونوں میں فرق ہے، اگر آپ کسی دل فریب منظر، خوب صورت پہاڑ، اور قیمتی ہیرے کو دیکھیں تو بے اختیار آپ کی زبان پر اس کی مدح و ستائش آنے لگ جائے گی، اس کی حمد نہ کرے گی، ایک شخص کی مدح میں رطب اللسان ہو سکتے ہیں، خواہ اس نے آپ پر احسان کیا ہو، یا نہ کیا ہو، حمد اسی صورت میں ہو گی جب آپ پر اس نے لطف و کرم کی بارش کی ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مداحین کی مذمت فرمائی ہے: احثوا التراب فی وجوہ المداحین اور حمد تو مطلوب و مقصود بالذات ہے۔

حمد پر جو الف لام داخل ہے، اسے بعض حضرات نے استغراق کا کہا ہے، اور دوسروں نے جنس کا، ہمارے نزدیک دونوں قول درست ہیں، مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جس قدر حسن و جمال، کمال و خوبی اور بخشش و فیضان ہے، خواہ وہ کہیں ہو، اور کسی شکل میں ہو، سب اسی واجب الوجود کی کارسازی و کارفرمائی ہے، اور جس قدر اور جیسی کچھ حمد و ثنا کی جائے گی وہ حقیقت میں اسی قدوس حق نواز کی ہو گی، جو تمام محاسن و کمالات کا جامع اور سرچشمہ ہے، جس کی ذات حسن ہی حسن اور خوبی ہی خوبی ہے۔

**اللہ** اصل میں الٰہ تھا، اس کے ہمزہ کو محذوف کر دیا گیا اور اس پر الف لام داخل کر دیا گیا، لغت

ہیں الٰہ ہر معبود پر بولا جاتا ہے، جس کی جمع آلہہ آتی ہے، عرب الٰہ اور آلہہ تو اپنے معبودانِ باطل پر بھی بولا کرتے تھے، قرآن میں آتا ہے: فراغ الی الھتھم فقال الا تاکلون (۳۷: ۹۱) پھر ابراہیم ان کے معبودان کی طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے کہ تم کھاتے کیوں نہیں، دوسری جگہ یوں ہے: وانطلق الملاء منھم ان امشوا واصبروا علی الھتکم، ان ھذا لشیئ یراد (۳۸: ۶) تو ان میں جو معزز تھے وہ چل کھڑے ہوئے اور بولے کہ چلو، اور اپنے معبودوں کی پوجا پر قائم رہو، بے شک یہ ایسی بات ہے جس سے تم پر شرف و فضیلت مقصود ہے، مگر اللہ صرف ذاتِ واحد کے لیے مخصوص تھا، اور وہ اپنے معبودوں کو اس نام سے نہیں پکارا کرتے تھے۔

حقیقت میں اللہ اسمِ ذات ہے، تمام صفات اور کمالات کو اسی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے: وللہ الاسماء الحسنیٰ فادعوہ بھا، وذروا الذین یلحدون فی اسمائہ (۷: ۱۸۰) اور خدا کے نام سب کے سب اچھے ہیں، تو اس کو اس کے ناموں سے پکارو، اور جو لوگ اس کے ناموں میں کجی اختیار کرتے ہیں، ان کو چھوڑ دو، ایک جگہ فرمایا: ان رحمۃ اللہ قریب من المحسنین (۷: ۵۶) کچھ شک نہیں کہ خدا کی رحمت نیکی کرنے والوں سے قریب ہے۔

**ربّ** اردو ترجمہ اس کا پالنے والا کیا جاتا ہے، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن پاک نے اس کو زیادہ وسیع معنی میں استعمال کیا ہے، سورۂ اعلیٰ میں آتا ہے: سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى، الَّذِي خَلَقَ فَسَوّٰى، وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى (۸۷: ۱ تا ۳) "اپنے پروردگار جلیل الشان کے نام کی تسبیح کرو، جس نے انسان کو بنایا، پھر اس کے اعضاء درست کیے، اور جس نے اس کا اندازہ ٹھہرایا پھر اس کو رستہ بتایا، ان آیات میں صنعت ربوبیت کے یہ چار کام بتائے ہیں:

۱۔ خلق، کائناتِ ارضی و سماوی کی ہر چیز کو عدمِ محض سے وجود میں لانا: بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (۲) وہی آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو اس کو ارشاد فرما دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے، سورۂ انعام میں یوں آتا ہے: بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ

تکن لہ صاحبۃ ، وخلق کل شیء وھو بکل شیء علیم (۶ : ۱۰۱) " وہی آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اس کے اولاد کہاں سے ہو جب کہ اس کی بیوی ہی نہیں، اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے

۲- تسویہ - ہر چیز کو ظاہری و باطنی قوتیں عطا کرنا، اور اس کے مختلف اجزاء و عناصر کو اس طرح آپس میں ترتیب دینا کہ سب ایک دوسرے کے مناسب و موزوں ہوں۔

۳- تقدیر - اس کے معنی اندازہ کرنے کے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو جو قوتیں عطا کی ہیں، ان کے اعمال و وظائف بھی مقرر کر دیئے ہیں، چنانچہ ہر چیز اسی اندازے کے مطابق اپنے اپنے دائرے میں مصروف عمل ہے ،: وخلق کل شیء فقدرہ تقدیرا (۲۵ : ۲) اور جس نے ہر چیز کو پیدا کیا، پھر اس کا اندازہ ٹھہرایا، دوسری جگہ آتا ہے

| | |
|---|---|
| والشمس تجری لمستقر لھا، ذلک | اور سورج اپنے مقررہ راستے میں چلتا رہتا ہے، یہ |
| تقدیر العزیز العلیم، والقمر قدرناہ | خدائے غالب اور دانا کا مقرر کیا ہوا اندازہ ہے |
| منازل حتی عاد کالعرجون القدیم، لا | اور چاند کی بھی ہم نے منزلیں مقرر کر دیں، یہاں تک |
| الشمس ینبغی لھا ان تدرک القمر | کہ گھٹتے گھٹتے کھجور کی پرانی شاخ کی طرح ہو جاتا ہے |
| ولا اللیل سابق النھار وکل فی فلک | نہ تو سورج ہی سے ہو سکتا ہے کہ چاند کو جا پکڑے |
| یسبحون (۳۶ : ۳۸ تا ۴۰) | اور نہ رات ہی دن سے پہلے آسکتی ہے، سب اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں ۔ |

۴- ہدایت - اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا کیا، اس کو بہترین ظاہری و باطنی قوتیں عطا کیں، پھر ان کے اعمال و وظائف مقرر فرما دیئے، اور ان سب کی تکمیل اس طرح کر دی کہ اس کے موافق اسباب کو فراہم کر دیا، موانع کو دور کر دیا، تاکہ وہ باقی و قائم رہ کر اپنے کام میں لگ سکے، اور جن نتائج و ثمرات کی اس سے توقع ہے وہ ظہور میں آئیں،

اس کو مثال میں یوں سمجھا یا جاسکتا ہے کہ ایک گھڑی ساز نے گھڑی بنانے کا ارادہ لیا، اب اس

کا سب سے پہلا کام یہ ہوگا کہ وہ تمام ضروری سامان فراہم کرے، پرزوں کو جمع کر کے ہر کیل کانٹے کو درست کر لے، یہ گھڑی کی تخلیق، اب اس نے ان تمام پرزوں کو اس طرح مرتب کیا کہ وہ ایک دوسرے سے بالکل متناسب ہو گئے، اسے تسویہ کا نام دیجیے، اس کے بعد ہر پرزے کو دوسرے کے ساتھ لگا دیا، اس ترکیب کو سامنے رکھ کر اس نے یہ اندازہ لگایا کہ یہ اتنی مدت تک چل سکے گی، اور اتنی دیر تک کام دے سکے گی، یہی تقدیر ہے، ان تمام مراتب کو طے کر لینے کے بعد اس نے گھڑی کو کوک دیا، اس امر کا اس نے پورا لحاظ کیا کہ وقت ٹھیک دے، گرمی سردی سے محفوظ رہے اور شکست و ریخت سے بچی رہے، یہ اس گھڑی کا مرتبہ ہدایت تھا۔

اب جو شخص اللہ کو رب العالمین کہہ کر پکارتا ہے، وہ اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ میری تمام ضروریات ظاہری و باطنی، جسمانی و روحانی، دینی اور دنیاوی، سب کا ذمہ دار و کفیل فقط وہی واحد و یگانہ خالق السموات والارض ہے۔

العٰلمین | اس کائناتِ ارضی و سماوی میں اس قدر کثرت سے عالم ہیں کہ آج تک نسل انسانی ان کا احاطہ نہیں کر سکی۔ عالم انسان، عالم حیوانات، عالم نباتات، جن کا کوئی شمار نہیں، اس بے پایاں سمندر کے چند قطرات ہیں۔ وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ (۷۴: ۳۱) اور تمہارے پروردگار کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

عالَم کی جمع عالمین ہے، یعنی بے شمار عالم، مفسرین کرام نے اس کے معنی تمام عالم کیے ہیں، جن میں جن و انس کے علاوہ حیوانات، نباتات، جمادات، دریا اور سمندر، ثوابت و سیارات اور بے شمار چیزیں شامل ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اس لفظ کی وسعت سب کو احاطہ کیے ہوئے ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس جگہ جو رب العٰلمین فرمایا تو اس سے کیا مراد ہے۔

اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہمیں قرآنِ حکیم کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ وہی اس کے معنی معین کرنے کا ذمہ دار اور ظنون و اوہام کے لیے حَکَم ہے۔ اگرچہ عالمین کا لفظ بکثرت قرآن پاک میں آتا ہے مگر ہم ان میں سے چند مقامات کو مخصوص کیے لیتے ہیں کہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہو، سورۃ آلِ عمران میں ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ، فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ، وَمَن دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا، وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا، وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ۔ (۳: ۹۶، ۹۷)

پہلا گھر جو لوگوں کے عبادت کرنے کے لیے مقرر کیا گیا تھا، وہی ہے جو مکہ میں ہے، بابرکت اور جہان کے لیے موجب ہدایت، اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں جن میں سے ایک ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے اور جو شخص اس مبارک گھر میں داخل ہوا اس نے امن پالیا اور لوگوں پر خدا کا حق ہے کہ جو اس گھر تک جانے کا مقدور رکھے وہ اس کا حج کرے، اور جو اس حکم کی تعمیل نہ کریگا تو خدا بھی اہلِ عالم سے بے نیاز ہے۔

آلِ عمران میں آگے چل کر فرمایا: تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ، وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِّلْعَالَمِينَ (۳: ۱۰۸) ایک جگہ آتا ہے: إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْعَالَمِينَ (۶: ۹۰) سورۂ یوسف میں یوں فرمایا: إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ (۱۲: ۱۰۴) سورہ الانبیاء میں اس طرح آتا ہے: وَنَجَّيْنَاهُ وَلُوطًا إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ (۲۱: ۷۱) اسی سورت میں یہ بھی ہے: وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهَا مِن رُّوحِنَا وَجَعَلْنَاهَا وَابْنَهَا آيَةً لِّلْعَالَمِينَ (۲۱: ۹۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ارشاد ہوا: وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (۲۹: ۱۵) سورۂ القلم کا خاتمہ اس پر ہوا: وَمَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ (۶۸: ۵۲)

یہ چند آیات جو نمونے کے طور پر آپ کے سامنے ہیں، یہ سب اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ عالمین کے معنی اس جگہ عالمِ انسان یعنی اس کی تمام اقوام و ملل ہیں جو اس زمین کی پشت پر آباد ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارک انسانوں ہی کی رشد و ہدایت کے لیے ہوتی تھی، وہی لوگ اس کے مخاطب ہیں، ان ہی کے لیے آپ نے فلاح و کامرانی کی راہیں کھولیں، اور ان ہی کو آپ نے دنیا و آخرت کی کامیابی کی بشارت دی: وَأَرْسَلْنَاكَ لِلنَّاسِ رَسُولًا (۴: ۷۹) اور ہم نے تم کو لوگوں کی ہدایت کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔

سورۂ فاتحہ قرآن کریم کی سب سے پہلی سورت ہے، اس میں رب العلمین فرمایا گیا، آخری سورت الناس ہے، اس میں یوں آتا ہے: قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ اِلٰهِ النَّاسِ، اوّل وآخر واضح کرتا ہے کہ اس سے مراد مختلف اقوام وملل انسانی اور ان کے شعوب وقبائل ہیں، جن کی ہدایت و راہ نمائی اس کے ذمہ ہے: لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (۲۵:۱) سورۂ شعراء میں قوم لوط کی یہ خرابی بیان کی گئی ہے: اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ (۲۶: ۱۶۵) کیا تم اہل وعیال میں سے لڑکے پر مائل ہوتے ہو، حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے رب العلمین سے اقوام ہی مراد لی ہیں کما صرح بہ محمد عبدہٗ

**تربیت کے اقسام** اللہ تعالیٰ جو قوموں اور ملتوں کی تربیت کرتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ خلقیہ، انسان کی نشوونما ہو، اس کا جسم اپنے کمال کو پہنچے اور اس کی نفسی وعقلی قوتیں اعلیٰ ترین درجہ حاصل کریں۔

۲۔ شرعیہ، اقوام وملل کی راہ نمائی اور ہدایت کے لیے انبیاء ورسل مبعوث ہوں، جو ان کی فطری استعداد کی تکمیل کریں، وہ حرام وحلال سے آگاہ ہوں، منہیاتِ شرعیہ سے پرہیز کرکے محاسن وکمالات کو حاصل کریں۔

**الرحمٰن الرحیم** اسمائے الٰہیہ میں سے یہ دونوں نام ایک ساتھ بیان کیے گئے ہیں، شاید اسی وجہ سے بعض مفسرین کا خیال ہے کہ الرحیم محض تاکید کے لیے آیا ہے، اردو ترجمہ کرنے والوں نے بھی ان کی تقلید میں دونوں کے فرق کو واضح نہیں کیا، مفتی محمد عبدہٗ رحمہ اللہ نے اس تاکید کے خیال کی بڑے زور سے مخالفت کی ہے،

اصل بات یہ ہے کہ عربی زبان میں فَعْلَان کا وزن عموماً ان صفات ومختصات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو عارضی ہوتی ہیں، مثلاً عطشان، غضبان، حیران، سکران وغیرہ، یعنی ان صفتوں کو ثبات ودوام نہیں، اب اگر وہ پیاسا ہے تو تھوڑی دیر کے لیے ہے، پانی پی لینے کے بعد اس کی یہ حالت باقی نہیں رہے گی، لیکن فَعِیْل ان صفتوں پر بولا جاتا ہے جو جذبات وعوارض ہونے کی وجہ سے مستقل ہوتی ہیں، اور اپنا فعلی ظہور بھی رکھتی ہیں، پس اَلرَّحْمٰن کے معنی تو یہ ہوئے کہ اللہ کی ذات میں رحمت کے

اور رحیم کا مطلب یہ ہوا کہ تمام کائنات ارضی و سماوی اس کی رحمت سے فیض یاب ہو رہی ہے۔ یہ فعل مستقل اور دائمی ہے، جس میں کبھی انقطاع نہیں ہوتا: وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (۷ : ۱۵۵) "اور جو میری رحمت ہے، وہ ہر چیز کو شامل ہے"۔ سورۂ انعام میں فرمایا: قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلْ لِّلّٰهِ، كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (۶ : ۱۲) "ان سے پوچھو کہ آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے کس کا ہے؛ کہہ دو خدا کا، اس نے اپنی ذات پاک پر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔

عرب کے لوگ اسم رحمٰن سے واقف نہ تھے، جب صلح نامہ حدیبیہ مرتب کیا گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے شروع میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لکھی تو سُہیل نے اس پر اعتراض کیا اور کہا، اَمَّا الرَّحْمٰنُ فَلَا نَعْرِفُہٗ۔ اللہ پر تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں مگر رحمٰن کو ہم نہیں پہچانتے۔ چنانچہ آپ نے صلح کی خاطر اس کو مٹا دیا۔ قرآن پاک میں آتا ہے، وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (۲۱ : ۳۶) حالانکہ وہ خود رحمٰن کے نام سے منکر ہیں۔ سورۂ فرقان میں ہے: اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ (۲۵ : ۶۰) اور جب ان کفار سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں کہ رحمٰن کیا،

ان لوگوں کا اسم رحمٰن سے ناواقف ہونا اس بات کا داعی ہوا کہ قرآن پاک میں ایک مستقل سورت اسی نام کی نازل کی گئی جس میں تفصیل کے ساتھ اس کے کرشمہ ہائے قدرت بیان کیے گئے اور ہر کرشمہ کے بعد یہ سوال ہوا: فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ "اے جن وانس، تم اس کے کرشمہ ہائے قدرت میں سے کس کس کا انکار کرو گے، یہ سورت اگر غور کیا جائے تو اسم رحمٰن کی بہترین تفسیر ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے مقامات میں بھی اس کے کارناموں کی تفصیل و توضیح کی، مثلاً فرمایا: اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى یعنی اِسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ، اللہ کی سلطنت، مالکیت، تربیت عمومی اور عرش پر بلند ہونے پر دلالت کرتا ہے: قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ، اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى (۱۷ : ۱۱۰) کہہ دو کہ تم خدا کو اللہ کے نام سے پکارو یا رحمٰن کے نام سے پکارو، جس نام سے پکارو، اس کے سب نام اچھے ہیں۔ شاید یہی اسباب تھے، جن کی وجہ سے رحمٰن بھی صرف اللہ ہی

کی ذات کے لیے مخصوص ہوگیا، اب ہم کسی انسان کو اس نام سے نہیں پکار سکتے، رحیم کہہ سکتے ہیں، قرآن پاک نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رحیم کہا ہے: بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ" (۹: ۱۲۸) اسم مبارک رحیم کی اگر تفسیر دیکھنی ہو تو سورۂ شعراء کو اوّل سے آخر تک پڑھ جانا چاہیے۔

رحمٰن و رحیم کے فرق و امتیاز باہمی کو واضح کرنے کے لیے شاید یہ مثال کچھ مدد دے سکے، دونوں ماں باپ مل کر اولاد کی تربیت کرتے ہیں، اس کی حفظ و نگہداشت میں لگ جاتے ہیں، محبت و شفقت سے اس کی نگرانی کرتے ہیں، مگر دونوں کی محبت میں نمایاں طور پر فرق دکھائی دیتا ہے، باپ اصول و کلیات پر نظر رکھتا ہے، جزئیات کی طرف اس کی کوئی توجہ نہیں ہوتی، لیکن ماں ہے کہ وہ مہمات امور کی بجائے اس کے ہر چھوٹے سے چھوٹے کام کا خیال رکھتی ہے، اور اس طرح دونوں مل کر اپنے بچہ کو پروان چڑھاتے ہیں، یہی حال رحمٰن و رحیم کا ہے، رحمٰن سے مراد وہ رحمتِ خاصہ ہے جو کائنات کی کلی ضروریات کو انجام دیتی ہے، اور اسم رحیم اس کی ہر جزئی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

(باقی آئندہ)

# سیاستِ فاروقیؓ

(محمد کرد علی)

[شام کے مشہور فاضل اور دمشق کی مجمع العلمی العربی کے صدر محمد کرد علی دورِ حاضر کے ایک باکمال عالم، ایک زبردست مؤرخ اور صاحبِ طرز ادیب تھے۔ صاحبِ موصوف ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۳ء میں وفات پائی۔ عربی ادب اور تاریخ نویسی پر اُن کی نظر گہری اور ناقدانہ تھی سادہ نگاری ان کی انشا کا زیور تھی۔ اسلوبِ بیان صاف و رواں اور تحریر عالمانہ وقار کی حامل۔ زیرِ نظر مقالہ ان کی ایک تصنیف: الاسلام و الحضارۃ العربیہ سے لیا گیا ہے۔ یہ کتاب مرحوم نے دو جلدوں میں تحریر فرمائی تھی اور حق یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے مصنف کی وسعتِ معلومات اور قوتِ استدلال کا ایک گہرا نقش قاری کے دل پر بیٹھتا ہے]

اپنی جانشینی کے لیے حضرت ابُوبکرؓ نے حضرت عمرؓ بن خطاب کو انتخاب کیا اور اس سلسلہ میں اپنے اُن ساتھیوں سے مشورہ فرمایا، جن کی سیاسی بصیرت مسلّم و ممتاز تھی۔ انہی اہل الرائے اصحاب میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ بھی تھے۔ انھوں نے صدیق اکبرؓ سے کہا: "عمرؓ کے متعلق آپ کی جو رائے ہے، بخدا ہم انھیں اس سے بھی افضل سمجھتے ہیں، لیکن ان کے مزاج میں سختی ہے۔" حضرت ابوبکرؓ نے جواب میں فرمایا: "اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مجھ میں نرمی پاتے تھے، لیکن ذمہ داری جب خود اُن پر آپڑے گی تو وہ اپنی بہت سی عادتیں چھوڑ دیں گے۔ ابو محمد! میرا تجربہ یہ ہے کہ جب میں کسی پر غصہ ہوتا تو وہ غصہ فرو کرنے کی کوشش کرتے اور نرمی دیکھتے تو سختی کا مشورہ دیتے۔" جب حضرت ابوبکرؓ کی بیماری نے شدت اختیار کی تو بالاخانہ پر تشریف لے گئے، نیچے آدمی جمع تھے، اُن سے مخاطب ہو کر فرمایا: "کیا تم اس شخص کو پسند کرو گے جسے میں ولی عہد مقرر کر دوں؟ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے غور و فکر میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی؛

ۓ تاریخ الطبری

نہ اس منصب کے لیے اپنے کسی رشتہ دار کو تجویز کیا ہے۔ میں عمرؓ بن خطاب کو اپنا جانشین مقرر کررہا ہوں۔ تم میری سنو اور مانو!" سب نے کہا "سَمِعْنَا وَ أَطَعْنَا" حضرت ابوبکرؓ نے ایک عہدنامہ بھی لکھوایا، جس کا مضمون یہ تھا: "یہ عہدنامہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلیفہ ابوبکرؓ کا ہے، جب کہ وہ اس دنیا سے کوچ کر رہا ہے اور عالمِ آخرت کے داخلہ کی پہلی ساعت ہے اور یہ وہ مرحلہ ہے جہاں کافر ایمان لے آتا ہے اور گنہ گار تائب ہو جاتا ہے۔ میں نے عمرؓ بن خطاب کو اپنا جانشین مقرر کیا ہے اگر وہ نیکی اور عدل کریں گے تو ان کی نسبت میرا گمان اور علم یہی ہے اور اگر وہ بدل گئے، انہوں نے ظلم و ناانصافی کی راہ اختیار کی تو میں عالم الغیب نہیں ہوں۔ میری نیت بخیر ہے اور ہر شخص اپنے کیے کا پھل پائے گا:

وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔ اور جو لوگ ظلم کریں گے وہ جلد دیکھ لیں گے کہ وہ کس پہلو پر پلٹا کھائیں گے۔

پھر حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو طلب فرمایا[1] اور جو سمجھانا تھا، انھیں سمجھایا۔ جب حضرت عمرؓ چلے گئے تو ہاتھ اٹھا کر دعا کی: یا اللہ! میں نے یہ انتخاب صرف مسلمانوں کی بہتری کے ارادہ اور اس اندیشہ سے کیا ہے کہ ان میں فساد نہ ہو۔ میں نے وہ کام کیا ہے جسے تو بہتر جانتا ہے۔ میں نے بہترین اور قوی ترین شخص کو اپنا جانشین بنایا ہے، جو سب سے زیادہ مسلمانوں کی راست روی کا خواہش مند ہے میرے لیے تیرا جو حکم آنا تھا، آچکا۔ اب میں ان کو تیرے سپرد کرتا ہوں۔ وہ تیرے بندے ہیں اور ان کی باگ تیرے ہاتھ میں ہے۔ یا اللہ! ان کے والی کو نیک توفیق دے، اسے خلفائے راشدینؓ کے زمرہ میں شامل فرما، جو تیرے نبی رحمتؐ کی ہدایت پر چلے اور اس کے لیے اس کی رعیت کو صلاحیت عطا کر![2]

ہر چند حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین نامزد فرما دیا تھا، لیکن اس کا ان لوگوں کی چہ میگوئیوں پر کوئی اثر نہ پڑا، جن کے دلوں میں آئندہ ہونے والے خلیفہ کے متعلق سوالات ابھر رہے تھے حضرت صدیق اکبرؓ نے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف سے فرمایا: "میں نے تمہاری امارت اس شخص کے سپرد کی ہے جو میرے نزدیک تم سب سے بہتر ہے۔ لیکن اس پر تم سب اندیشہ مند ہو گئے گویا امیر کسی

---

[1] تہذیب الاسماء، للنووی [2] الکامل للمبرد

اور کو ہونا چاہیے تھا۔ تم نے دیکھا کہ دنیا تمہاری طرف بڑھی چلی آرہی ہے اور تم اُس پر ریجھ گئے تا آں کہ حریری پردوں اور دیبائی مسندوں کو تم نے اپنی زندگی بنا لیا۔ تم آذربائیجان کے اونی بستروں پر اس طرح بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگے، جیسے تم میں سے کوئی سعدان[1] کے کانٹوں پر سو رہا ہو"۔ لیکن اس سلسلہ میں حضرت ابوبکرؓ نے نیت کی جس بے لوثی اور ارادہ کے جس استحکام کا ثبوت دیا اُس نے معترضین کے ہونٹ سی دیئے اور اختلاف و عناد کے سرکش گھوڑوں کی لگامیں کھینچ لیں، جس کی وجہ سے فضا ہر قسم کے ہنگامے اور فتنہ و فساد سے پاک و صاف رہی۔ بنو ہاشم نے جب یہ دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین نامزد فرما دیا ہے تو وہ بھی اپنے سردار کے استخلاف کی طرف سے مایوس ہو گئے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ خلیفہ ثانی ان حضرات میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں، جو ہر لوث اور ہر غرض سے ماورا ہیں جنھیں مسلمانوں کی بہتری اور استحکام کے سوا، اور کوئی مقصد عزیز نہیں۔ اور جن کے قدم صرف اسی رستے پر اُٹھتے ہیں؛ جو شارع اسلام علیہ التحیۃ والسلام نے تجویز فرمایا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے محسوس فرمایا کہ زمام خلافت سنبھالنے کے لیے حضرت عمرؓ سے زیادہ قوی دست انسان اور کوئی نہیں ہے۔ انھوں نے حضرت عمرؓ کے بارے میں مسلمانوں سے مشورہ کیا۔ کچھ لوگوں نے اس انتخاب کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور کچھ نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ لیکن جن لوگوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا، وہ بھی بعد کو اس پر رضامند ہو گئے۔

مسند نشینِ خلافت ہونے کے بعد سب سے پہلی بات جو حضرت عمرؓ کی زبان سے ادا ہوئی، وہ یہ تھی: "عرب کی مثال نکیل پڑے اونٹ کی سی ہے، جو ساربان کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ اب یہ دیکھنا ساربان کا کام ہے کہ اسے کس طرح ہانکے۔ رہا میں، سو رب کعبہ کی قسم! میں اُنھیں رستے پر لا کے چھوڑوں گا"۔

فاروق اعظمؓ جب حضرت ابوبکرؓ کی تدفین سے فارغ ہوئے تو ہاتھوں سے مٹی جھاڑی اور اپنی جگہ خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے۔ انھوں نے فرمایا: "اللہ نے تمہیں میرے اور مجھے تمہارے شاملِ حال کر دیا۔ اور میرے دونوں صاحبوں کے بعد مجھے تم میں باقی رکھا۔ خدا کی قسم! تمہارا جو معاملہ میرے سامنے آئے گا میرے حکم کے بغیر کوئی اس کو طے نہ کرے گا اور جو معاملہ میری نظروں سے دُور ہو گا، میں پوری امانت و

[1] ایک خاردار بوٹی، جو اونٹ کی من بھاتی غذا ہے۔

کفایت کے ساتھ اس میں اپنی کوشش صرف کروں گا۔ اگر لوگ مجھ سے احسان اور بھلائی کے ساتھ پیش آئیں گے تو میں بھی اُن کے ساتھ احسان اور بھلائی کے ساتھ پیش آؤں گا اور اگر بدی کریں گے تو میں بھی اُنھیں سزا دُوں گا۔ کہنے والوں نے کہا کہ بخدا! انھوں نے اپنے اس قول میں بال برابر زیادتی نہ کی تاآنکہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے" ان کا ایک اور قول ہے: "یا اللہ! میں سخت ہوں، مجھے نرم کردے۔ میں کمزور ہوں مجھے توانائی عطا فرما میں بخیل ہوں، مجھے سخی بنادے"!

حضرت عمرؓ نے ہر ملک میں عظیم الشان فتوحات حاصل کیں۔ ان کی فتوحات میں مصر اور شام عراق اور جزیرہ، ارمینیہ اور ایران، خوزستان اور آذربائیجان، الجبال اور طرابلس شامل ہیں اور ان فتوحات کی مثال اسلام میں نہ ان سے پہلے کہیں ملتی ہے، نہ ان کے بعد۔ ان کا کوئی نشانہ خالی گیا نہ ان کا کوئی پرچم سرنگوں ہوا۔ مسلمانوں کی زندگی انھیں اپنی جان سے زیادہ پیاری تھی اور اپنے لشکروں کی کمان وہ ایسے لوگوں کے سپرد فرماتے تھے جو علم و نظر میں اپنا خاص مرتبہ رکھتے تھے۔ نہاوند کے معرکے میں انھوں نے نعمان بن مقرن کو لکھا: امابعد! مجھے اطلاع ملی ہے کہ نہاوند کے شہر میں عجمیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ تمہارے مقابلے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ جب میرا یہ خط تمہیں ملے اللہ کے حکم اور اس کی نصرت و اعانت کے سائے میں اُن مسلمانوں کو لے کر روانہ ہو جاؤ، جو تمہارے ساتھ ہیں۔ انہیں دشوار گزار راہوں سے مت لے جانا کہ ان کو تکلیف ہوگی۔ ان کا حق نہ روکنا کہ اس سے ان کے دلوں میں نفرت بیٹھے گی اور نہ انھیں گھنے جنگلوں میں لے کر داخل ہونا کہ مسلمانوں کا ایک فرد مجھے ایک لاکھ دیناروں سے زیادہ محبوب ہے۔ اور جب ان کے کسی سپہ سالار یا ساتھی کی موت کی اطلاع انہیں دی جاتی تو بے اختیار اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ چاہے اس اطلاع کے ساتھ کسی بڑے سے بڑے ملک کی نوید فتح ہی کیوں نہ ہوتی۔

حضرت عمرؓ کی راستی ان کے دو صاحبوں کی راستی تھی اور حضرت عمرؓ کی زبان ان کے دو صاحبوں کی زبان۔ سلمہ اشجعی کو جب کردوں کی سرکوبی کے لیے بھیجا تو ان سے کہا: "اللہ کا نام لے کر روانہ ہو جاؤ اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے قتال کرو جنھوں نے اللہ سے بغاوت کی ہے۔ اگر تمہیں اپنے مشرک دشمنوں سے

مقابلہ پیش آ جائے تو ان کے سامنے تین چیزیں پیش کرو : انہیں اسلام کی دعوت دو ۔ اگر وہ مسلمان ہو جائیں اور اپنے گھر بیٹھنا پسند کریں تو ان کے مال سے زکوٰۃ وصول کرنا تم پر فرض ہے ۔ مسلمانوں کی فَے میں ان کا کوئی حصہ نہیں ۔ اور اگر وہ تمہارے ساتھ مل کر لڑنا پسند کریں تو ان کے بھی حقوق و فرائض وہی ہوں گے جو تمہارے ہیں ۔ لیکن اگر وہ قبولِ اسلام سے انکار کر دیں تو ان سے خراج طلب کرو اور ان کی طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ نہ ڈالو ، اگر وہ خراج ادا کرنے کے لیے تیار نہ ہوں تو ان سے جنگ کرو ، اللہ تعالیٰ ان کے خلاف تمہارا حامی و ناصر ہے اور اگر وہ تمہارے خوف سے قلعہ بند ہو جائیں اور تم سے اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کے مطابق معاملت کی درخواست کریں تو ایسا نہ کرنا ، کیوں کہ تم نہیں جانتے کہ ان کے بارے میں اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم کیا ہے اور اگر وہ تم سے اللہ اور اس کے رسولؐ کی ذمہ داری میں پناہ طلب کریں ، تو اللہ اور اس کے رسولؐ کی نہیں ، صرف اپنی ذمہ داری کی حامی بھرنا ۔ اور اگر وہ تم سے جنگ کریں تو زیادتی اور بدعہدی نہ کرنا ، ان کے ناک کان نہ کاٹنا اور نومولود کو قتل نہ کرنا ۔"

صحابہ میں جو اربابِ حل و عقد تھے اور ان میں حضرت علیؓ بھی تھے ، وہ حضرت عمرؓ سے خوش تھے اس لیے کہ حضرت عمرؓ کی خدمات ان کے لیے سرمایۂ راحت تھیں ، حضرت عمرؓ کا قول ہے : میرے پاس جب دو آدمی جھگڑتے ہوئے آتے ہیں تو میں اس کی پروا نہیں کرتا کہ ان میں سے حق بجانب کون ہے؟ اور فرماتے ہیں : میرے دو ساتھی گزر چکے ۔ انھوں نے ایک ہی کام کیا اور ایک ہی راہ اختیار کی ۔ اگر میرا عمل ان کے خلاف ہوا ، تو گویا ان کی راہ چھوڑ کر میں نے الگ راہ اختیار کی ۔" وہی ہیں جن کے متعلق حدیثِ نبویؐ ہے : "اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتے ۔" سرکارِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور ارشاد ہے : "بلاشبہ اللہ نے عمرؓ کے دل میں اور ان کی زبان پر حق رکھ دیا ہے ۔" نبی رحمت علیہ التحیۃ والتسلیم کا یہ ارشاد بھی فاروقِ اعظم کی کتابِ مناقب کا عنوانِ زرّیں ہے : "اللہ کے معاملہ میں جتنے سخت عمرؓ ہیں ، میری امّت میں اور کوئی نہیں ۔" حضرت عمرؓ کے ایک واصف کا قول ہے : "وہ حق کے لیے سخی اور باطل کے لیے بخیل تھے ۔"

خارجی اور داخلی سیاست میں حضرت عمرؓ کا مرتبہ بہت بلند تھا ۔ حجاز کی دو ہمسایہ سلطنتوں ــــ ایران و

روم ۔۔۔ کے انہوں نے پرخچے اڑا کر رکھ دیئے۔ شان دار فتوحات نے اُن کی تلواروں سے پیمانِ وفا باندھ رکھا تھا اور اس عظیم و جلیل توفیق کا راز یہ تھا کہ فاروق اعظم کی نگاہ بڑی دوربیں اور اُن کی معنوی قوت بڑی بے پناہ تھی۔ وہ اہل الرائے کے مشوروں پر عمل کرتے تھے اور وُلاۃ و عمال کے انتخاب میں حسنِ بصیرت سے کام لیتے تھے۔ کوئی نفع بخش کام نہ تھا جسے وہ نہ کرتے ہوں اور کوئی قوت نہ تھی، جس سے وہ فائدہ نہ اٹھاتے ہوں دنیوی ساز و سامان کو وہ ہیچ سمجھتے تھے اور یہاں کی کسی نعمت، کسی راحت کی طلب ان کے دل میں پیدا نہ ہوتی تھی۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرح وہ بھی سادہ و بے رنگ زندگی کو پسند کرتے تھے[1] اور ہر قسم کے آرام و آسائش سے دامن کش رہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کے عمال بھی تمام عادات و خصائل اور افعال و اخلاق میں انہی کی پیروی کریں۔ وہ اونی جبہ پہنتے، جس میں چمڑے وغیرہ کے پیوند لگے ہوتے اور اونی چغے میں لپٹے رہتے۔ وہ اپنے کندھوں پر پانی سے بھرا ہوا مشکیزہ اٹھاتے اور یہی حال ان کے عمال کا تھا، حالانکہ اللہ نے اُن پر ملکی فتوحات کے دروازے کھول دیئے تھے اور انہیں دولت و ثروت سے مالا مال کر رکھا تھا۔ حضرت عمرؓ اپنی چادر اوڑھ کے مسجد کے ایک گوشے میں سو جایا کرتے تھے[2]۔ جب تستر کے حاکم: ہرمزان کو مدینہ لایا گیا، تو اس کے ساتھیوں نے حضرت عمرؓ کے متعلق پوچھنا شروع کیا۔ لوگوں نے کہا: وہ ابھی یہاں سے گزرے ہیں۔ ہرمزان نے جو یہ دیکھا کہ امیر المومنینؓ عام آدمیوں کی طرح بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں، تو اس کے دل میں ان کی حیثیت کم ہو گئی۔ آخر کار وہ ان کے پاس پہنچا۔ فاروق اعظمؓ اس وقت مسجد کے ایک گوشے میں استراحت فرما تھے۔ ہرمزان نے کہا: بخدا! بڑا خوش نصیب ہے یہ بادشاہ، جو کہتا ہے کہ مجھے کسی حفاظتی دستہ کی ضرورت نہیں۔ جب حضرت عمرؓ اٹھ کر بیٹھے تو ان کے وقار، تمکنت اور پرہیزگاری کے جلال کو دیکھ کر اس عجمی رئیس کا دل ہیبت سے لرز اٹھا۔

حضرت علیؓ بن ابی طالب بھی حضرت عمرؓ کی مجلسِ شوریٰ کے ایک رکن تھے۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے روم کے معرکہ میں اپنی شرکت کے متعلق ان کی رائے دریافت کی۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: اگر آپ خود اس دشمن کی طرف جائیں گے تو اندیشہ ہے کہ لڑائی میں آپ کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔ آپ ان کے بعد دراز

۱۔ مروج الذہب للمسعودی ۲۔ الکامل للمبرد

ملک کی راہ میں مسلمانوں کے لیے روک نہ بنیے! آپ کے بعد کوئی ٹھکانہ نہ ہوگا جس کی طرف مسلمان لوٹ سکیں، اس لیے اپنی بجائے کسی جنگ آزمودہ سالار کو بھیجیے اور ایسے لوگ اس کے ساتھ کیجیے جو شمشیرزن بھی ہوں اور اہلِ نصیحت بھی۔ اگر اللہ نے انھیں غالب کر دیا تو آپ کی مراد بر آئی اور اگر دوسری صورت ہوئی تو آپ لوگوں کے لیے چادر اور مسلمانوں کے لیے نقطۂ اجتماع ہوں گے۔"[1] اسی طرح جب حضرت عمرؓ ایرانیوں سے لڑنے عجم کے محاذ پر تشریف لے جانا چاہتے تھے، اس وقت بھی انھوں نے حضرت علیؓ سے مشورہ فرمایا جس کے جواب میں حضرت علیؓ نے کہا: یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کی کامیابی یا ناکامی کا مدار کثرت و قلت پر نہیں ہے۔ امیر اپنی قوم میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو حیثیتِ تسبیح میں رشتے کی ہوتی ہے۔ جہاں رشتہ ٹوٹا، تسبیح کے دانے بکھرے، اور اس کے بعد قیامت تک وہ سب کے سب جمع نہیں ہو سکتے۔ عرب اگرچہ قلیل التعداد ہیں لیکن اسلام نے ان کی قلت کو کثرت سے بدل دیا ہے اور ان کی اجتماعی حیثیت نے انہیں عزیز و ارجمند بنا دیا ہے۔ پس آپ کو چاہیے کہ مدارِ کار بن کر عربوں سے کام لیتے رہیں۔ جنگ کی آگ سلگائیں، مگر خود جا کر نہیں۔ اس لیے کہ اگر آپ نے اس سرزمین سے کوچ کیا تو اطراف و اکناف سے عرب آپ پر ہجوم کر دیں گے اور آپ کے پیچھے جو مسائل و مصائب رونما ہوں گے، انہیں دیکھ کر آپ سامنے کے خطرات کو بھول جائیں گے۔ پھر جب ایرانی آپ کو دیکھیں گے تو کہیں گے یہ عربوں کا سردار ہے اگر اس کا قصہ پاک کر دیا تو پھر آرام ہی آرام ہے۔ یہ چیز ان کتوں کو آپ کے لیے زیادہ خطرناک بنا دے گی اور وہ آپ کی جان کے درپے ہو جائیں گے اور یہ جو آپ نے فرمایا ہے کہ ایرانی مسلمانوں سے لڑنے کے لیے روانہ ہو گئے ہیں تو اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کو ان کی روانگی آپ سے زیادہ ناگوار ہے اور جو بات اسے ناگوار ہے، اس کو بدلنے پر وہ آپ سے زیادہ قادر ہے۔" اس طرح حضرت عمرؓ ان فتوحات آفریں جنگوں میں بہ نفس نفیس شریک نہیں ہوئے جو ان کے زمانۂ خلافت میں لڑی گئیں، ور عہدِ رسالتؐ میں بھی کم ہی غزوات ہیں جن میں انہوں نے شرکت فرمائی۔

---

[1] نہج البلاغہ: فارضی

حضرت عمرؓ مکہ میں تھے کہ انہوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیعت کے متعلق کوئی بات سنی اور لوگوں سے خطاب کرنے کا ارادہ کیا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے ان سے کہا: امیرالمومنینؓ! ایسا نہ کیجیے! حج کا زمانہ ہے اور ہر قسم کے اچھے بُرے لوگ جمع ہیں۔ جب آپ خطبہ دینے کھڑے ہونگے تو یہ لوگ زیادہ سے زیادہ آپ کے قریب جگہ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے اور مجھے ڈر ہے کہ جب آپ کھڑے ہو کر کچھ فرمائیں گے تو یہ بے سمجھے بوجھے اسے ہر ایک کے سامنے نقل کریں گے۔ نہ غور سے آپ کی بات سنیں گے، نہ اس کے صحیح محل پر اسے رکھیں گے۔ مدینے پہنچنے تک صبر کیجیے! وہ ہجرت اور سنت کا گھر ہے وہاں اہلِ نظر اور شرفائے قوم سے مل کر جو کچھ فرمانا ہو، اطمینان و سکون سے فرمائیے گا۔ اہلِ علم آپ کے ارشادات پوری توجہ سے سنیں گے اور انہیں ان کے صحیح محل پر رکھیں گے۔" حضرت عمرؓ نے ایسا ہی کیا اور امتِ مسلمہ کے مالدار حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی نصیحت پر اسی طرح عمل فرمایا جس طرح حضرت علیؓ ابن ابی طالب کی نصیحت پر عمل فرمایا تھا۔

سلطنت کی خدمت کے لیے بہتر سے بہتر آدمی کے انتخاب میں حضرت عمرؓ کسی خواہش اور کسی غرض سے مغلوب نہ ہوتے تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ لوگوں کے دلوں میں کیا ہے۔ وہ ہر چیز کو اس کے خانے میں رکھتے تھے اور اس کی صحیح صحیح قیمت جانتے تھے۔ ایک دن لوگوں کو جہاد کی دعوت دینے کے لیے مسجد میں کھڑے ہوئے اور انہیں جوش دلاتے ہوئے کہا: اللہ نے قیصر و کسریٰ کے ملکوں کے دروازے تم پر کھول دیئے ہیں۔ اٹھو! اور سرزمینِ ایران کی طرف قدم زن ہو جاؤ!" ابو عبید بن مسعود ثقفی اٹھے اور کہا: امیرالمومنینؓ! سب سے پہلے میں آپ کی دعوت پر لبیک کہتا ہوں!" ابو عبید کے لبیک کہتے ہی اور لوگوں نے بھی اپنی آمادگی ظاہر کر دی۔ حضرت عمرؓ سے کہا گیا کہ اس فوج کا سالار مہاجرینؓ یا انصارؓ میں سے کسی کو بنائیے! حضرت عمرؓ نے فرمایا: "نہیں! میں امیر اسی کو بناؤں گا جس نے سب سے پہلے میری دعوت قبول کی ہے۔" حضرت عمرؓ ہمیشہ ان مخفی و جلی باتوں سے یقین کی حد تک باخبر رہتے تھے جو دور و نزدیک گردش کرتی رہتی تھیں اور قلب و گوش کے لیے سرمایہ بن جاتی تھیں۔ اور وہ اس زیرکی و جانبازی پر بھی بطورِ خاص نظر رکھتے تھے جس سے مسلمانوں کی پوزیشن مضبوط ہوتی تھی۔ انہوں نے اپنے لیے امیرالمومنین کا لقب

اختیار کیا اور وہ سب سے پہلے شخص تھے جنہیں اس لقب سے پکارا گیا۔ لوگ حضرت ابوبکرؓ کو خلیفۂ رسول اللہ کہتے تھے۔ جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو انہیں خلیفۂ خلیفۂ رسول اللہ کہنے میں تکلف اور دشواری پیش آئی۔ اس لیے لفظ خلیفہ یا امیرالمومنین پر اکتفا کیا گیا۔

جب فاروقِ اعظمؓ ابولولوہ کے ہاتھوں زخمی ہوئے اور ان کا قتل نتیجہ تھا اس سازش کا جو ہرمزان نے عربوں سے نفرت کے زیر اثر مرتب کی تھی۔ کیونکہ عربوں نے ایرانی تخت پر قبضہ کر لیا تھا ـــ تو سب سے پہلی بات جو خون بہتے میں حضرت عمرؓ نے سوچی، وہ خلافت کے متعلق تھی۔ انہوں نے عبدالرحمٰن بن عوف کو بلایا[۱] اور ان سے فرمایا: "میں تم سے ایک وعدہ لینا چاہتا ہوں!" حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے کہا: "امیرالمومنینؓ! اگر آپ مجھ سے فرمائیں گے تو میں قبول کر لوں گا۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا: "تم کیا سمجھ رہے ہو؟" بولے: "آپ کو خدا کی قسم! آپ اسی چیز ـــ خلافت ـــ کے متعلق فرما رہے ہیں نا؟" حضرت عمرؓ نے جواب دیا: "بخدا! نہیں!" حضرت عبدالرحمٰنؓ نے کہا "واللہ! اب میں اس میں کبھی دخل نہ دوں گا۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا: "اس وقت تک خاموش رہو جب تک میں ان لوگوں سے وعدہ نہ لے لوں، جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری دم تک خوش رہے۔ علیؓ، عثمانؓ، زبیرؓ اور سعدؓ کو میرے پاس بلالاؤ۔" جب یہ حضرات آگئے تو ان سے گفتگو کے دوران میں فرمایا: "اپنے بھائی طلحہؓ کا تین دن انتظار کرنا ـــ حضرت طلحہؓ مدینہ سے باہر کہیں تشریف لے گئے تھے ـــ اگر وہ آجائیں تو بہتر ہے ورنہ آپس ہی میں فیصلہ کر لینا۔" اس کے بعد حضرت علیؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا: "علیؓ! تمہیں خدا کی قسم! اگر امارت تم کو سونپی جائے تو بنو ہاشم کو لوگوں کی گردنوں پر سوار نہ کر دینا۔ اور اے عثمانؓ! تمہیں خدا کی قسم! اگر خلافت کا فیصلہ تمہارے حق میں ہو تو بنو ابی معیط کو لوگوں کی گردنوں پر سوار نہ کر دینا اور اے سعدؓ! تمہیں خدا کی قسم! اگر خلیفہ تم کو بنایا جائے تو اپنے رشتہ داروں کو لوگوں کی گردنوں پر سوار نہ کر دینا۔ اٹھو! اور آپس میں مشورہ کر کے اپنا مسئلہ طے کر لو! لوگوں کو نماز صہیبؓ پڑھائیں گے۔" اس کے بعد انتقال سے تھوڑی دیر پہلے حضرت ابوطلحہؓ انصاری کو بلایا اور ان سے کہا: انصار کے پچاس آدمی لے کر ان کے دروازہ پر کھڑے

[۱] فان فلوٹن کی "السیادة العربیة" تعریب حسن ابراہیم حسن و محمد زکی ابراہیم [۲] تاریخ طبری

ہو جاؤ اور جب تک خلیفہ کا انتخاب عمل میں نہ آجائے، کسی کو اندر نہ جانے دو۔" اور فرمایا: "میں اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کو عربوں کے لیے وصیت کرتا ہوں کہ وہ اسلام کا مایۂ خمیر ہیں۔ میں اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری کی وصیت کرتا ہوں کہ وہ لوگوں کے عہد پورے کرے۔ یا اللہ! کیا میں نے ابلاغ کا حق ادا کر دیا؟ میں اپنے جانشین کے لیے خوب سے خوب تر آسائش و راحت چھوڑے جا رہا ہوں۔"

جب حضرت عمرؓ پر حملہ کیا گیا تو لوگوں نے کہا: امیرالمومنینؓ! اگر آپ کسی کو اپنا جانشین نامزد فرما دیتے تو اچھا تھا۔" فرمایا: کسے نامزد کروں؟ اگر ابو عبیدہ بن الجراح زندہ ہوتے تو انہیں خلیفہ بنا دیتا اور میرا رب مجھ سے پوچھتا، تو کہہ دیتا کہ میں نے تیرے نبیؐ کو فرماتے سنا ہے: ابو عبیدہؓ اس امت کے امین ہیں۔ اگر سالمؓ مولائے ابی حذیفہؓ زندہ ہوتے، تو خلافت ان کے سپرد کر دیتا اور میرا رب مجھ سے پوچھتا، تو کہہ دیتا کہ میں نے تیرے نبیؐ کو فرماتے سنا ہے: سالمؓ اللہ سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔" کسی نے عرض کی: "میں عبداللہ بن عمرؓ کا نام پیش کرتا ہوں۔" فرمایا: "اللہ تجھے مارے! بخدا! یہ بات کہنے میں تیری نیت بخیر نہیں ہے۔ افسوس ہے تجھ پر۔ میں ایسے شخص کو خلیفہ کیسے بنا دوں، جو اپنی بیوی کو طلاق بھی نہ دے سکا۔ ہمیں تمہاری امارت کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں اگر اسے خوش آیند سمجھتا تو اپنے کسی رشتہ دار کو اس کی ترغیب دیتا۔ اگر وہ بھلائی ہے تو ہم نے حاصل کر لی اور برائی ہے تو ہم اس سے دامن کش ہو گئے البتہ مجھ سے جہاں تک ہو سکا، میں نے اپنی جان کھپائی اور اپنے رشتہ داروں کو محروم کر دیا۔ اگر میں برابر چھوٹ جاؤں کہ نہ مجھے سزا ملے، نہ جزا، تو میں یقیناً اپنے تئیں خوش نصیب سمجھوں گا۔ دیکھو! میں اپنا جانشین نامزد کروں تو کر سکتا ہوں کہ جو مجھ سے بہتر تھے ــــ حضرت ابوبکر صدیقؓ ــــ انہوں نے اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ اور اگر کسی کو خلیفہ نہ بناؤں، تو یہ بھی کر سکتا ہوں کہ جو مجھ سے بہتر تھے ــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ــــ انہوں نے ایسا کیا تھا۔ اور اللہ اپنے دین کو ہرگز ضائع نہ کرے گا۔"

حضرت عمرؓ نے شوریٰ کا معاملہ چھ کبار صحابہؓ پر چھوڑ دیا، جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات تک خوش رہے اور حضرت علیؓ بن ابی طالب، حضرت عثمان بن عفانؓ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

حواری اور آپؐ کے پھوپھی زاد بھائی حضرت زبیرؓ بن عوام، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ کے نام لے کر کہہ دیا کہ ان میں سے کسی ایک کو منتخب کر لیا جائے۔ اور ان حضرات سے فرمایا: جب تم کسی کو والی مقرر کر لو تو بہتر سے بہتر طریق پر اس کا ہاتھ بٹانا اور اس کی مدد کرنا۔ جسے امین سمجھا جاتا ہے امانت اسی کے سپرد کی جاتی ہے۔ شوریٰ کا سہ روزہ اجلاس شروع ہوا۔ ارکان شوریٰ نے یہ طے کر لیا تھا کہ چوتھا دن ہونے سے پہلے پہلے وہ اپنے میں سے کسی کو امیر منتخب کریں گے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت مقدادؓ بن اسود کو حکم دیا ان کے سروں پر کھڑے ہو جاؤ۔ اگر ان میں سے پانچ ارکان کسی ایک شخص کے حق میں یک زبان ہو جائیں اور ایک رکن اختلاف کرے تو اس کا سر کچل دینا، یا تلوار سے اس کی گردن مار دینا۔ اور اگر چار آدمی متفق ہو کر کسی کے حق میں فیصلہ کریں اور باقی کے دو ان کے ہم رائے نہ ہوں، تو ان دونوں کے سر اڑا دینا۔ اور اگر تین آدمی ایک طرف ہوں اور تین آدمی دوسری طرف۔ تو عبداللہ بن عمرؓ کو حکم بنانا۔ اور عبداللہ بن عمرؓ کا فیصلہ قبول نہ کیا جائے تو اس گروہ کا ساتھ دینا، جس میں عبدالرحمٰنؓ بن عوف ہوں اور باقی کے لوگوں کو قتل کر دینا کہ وہ جماعت سے روگردانی کے مجرم ہوں گے۔"

حضرت عمرؓ نے خلیفہ کے انتخاب کی ایک ایسی عجیب صورت وضع کی، جس کی مثال اس سے پہلے کہیں نہیں ملتی۔ ان کے سیاسی کارناموں کی بہت سی مثالیں ہیں، جن میں اختراع و عبقریت کی شان اپنے تمام لوازم کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ ان کی یہی سیاسی بصیرت تھی، جس نے ان بزرگوں سے ارکان شوریٰ کے مقاصد اُن پر آئینہ کر دیئے تھے۔ اور وہ ڈر رہے تھے کہ اگر سینوں میں حسد رینگنے لگا اور دلوں میں کینہ و غضب کے تار متحرک ہو گئے، تو اُمت زوال و انحطاط کا شکار ہو جائے گی۔ انھوں نے فرمایا تھا: اس معاملے میں اصلاح نہیں ہو سکتی، بغیر اس شدت کے جس میں جبر نہ ہو، اور بغیر اس نرمی کے جس میں سستی نہ ہو" وہ جانتے تھے کہ ان نازک اور خطرناک مراحل میں شدت کے بغیر بات نہیں بنتی۔ بقول طبری ادھر مسلمانوں کے ممتاز اور صائب الرائے افراد بیعت کے لیے آگے بڑھے[1] ادھر حلقہ

[1] تاریخ طبری

بگوشِ اطاعت ہونے کے لیے عوام کا تانتا بندھ گیا۔ اور فتنے کے جراثیم اپنی موت آپ مر گئے، بالکل اسی طرح جیسے سقیفہ بنی ساعدہ کے دن حضرت عمرؓ نے فوراً آگے بڑھ کر حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کی تھی اور جو صحابہؓ تکلف و گریز سے کام لے رہے تھے، انہیں پہلے نرمی اور بعد کو سختی سے بیعت پر مجبور کیا تھا۔ حضرت عمرؓ کا یہ کارنامہ ان کے تمام کارناموں سے زیادہ محکم و پائدار تھا۔ وہ زندگی بھر امت کی بھلائی میں کوشاں رہے اور ان سے برداشت نہ ہو سکا کہ اپنی موت کے بعد اسے انارکی میں مبتلا چھوڑ جائیں۔

حضرت ابوبکرؓ، پھر حضرت عمرؓ اور ان کے بعد حضرت عثمانؓ کے استخلاف کے سلسلہ میں جو واقعات پیش آئے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ خلافت رسولؐ ایک مذہبی علامت تھی۔ اسے نماز اور روزہ کی طرح شرعی عبادات کی روش پر چلایا جا رہا تھا۔ بلکہ صدرِ اوّل کے مسلمان حاکم سازی، جنگی تدابیر اور ملکی انتظام کی طرح اس کو بھی ایک دینی معاملہ سمجھتے تھے۔ یہ منصب خلیفۂ اوّل کو وصیت یا زیادہ محتاط لفظوں میں "ایمانی وصیت" کے تحت ملا۔ خلیفۂ ثانیؓ ایک صاف امر اور صریح وصیت کے مطابق اس منصب پر فائز کیے گئے اور خلیفۂ ثالثؓ کو اربابِ حل و عقد کی مجلسِ شوریٰ نے اس منصب کے لیے منتخب کیا۔ اور اس طرح اسلام نے جمہوری نظام اور مذہبی نظام کو سمو دیا۔ جس میں زمانے کے حالات اور امت کے مصالح کا پورا پورا لحاظ تھا۔ روحانیت اور مادیت کے اس ملے جلے اقتدار میں ابتداً وہ معقول و معتدل استبداد بھی شامل تھا، جس کے بغیر جماعت کے معاملات کی تنظیم نہیں ہو سکتی۔ اور جو لوگوں کو اطاعت پر آمادہ کرتا ہے ــــ اولی الامر، یعنی اُن ائمہ کی اطاعت پر، جنہیں حکومت کی باگ ڈور سونپی جائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

| | |
|---|---|
| يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللّٰهَ وَ | اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسولؐ اور اپنے |
| أَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ | حاکموں کی اطاعت کرو! |

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا: عمرؓ بن خطاب کی لاش جب مسہری پر رکھی گئی، تو اس سے پہلے کہ جنازہ اٹھے، لوگ اس کے چاروں طرف کھڑے ہو کر دعائیں مانگنے لگے۔

میں بھی ان میں تھا۔ یکایک کسی نے پُشت کی طرف سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے گھبرا کے دیکھا تو علیؓ بن ابی طالب، عمرؓ کے لیے دعائے مغفرت کر رہے تھے۔ انھوں نے میت کو مخاطب کرکے کہا اللہ تم پر رحم فرمائے تمہارے سوا کوئی ایسا نہیں ہے جس کے متعلق میرے دل میں تمنا ہو کہ میں اُس کا سا نامۂ اعمال لے کر اپنے اللہ کے حضور حاضر ہوں۔ خدا کی قسم! میرا تو یہی گمان ہے کہ اللہ آپ کو آپ کے دونوں ساتھیوں —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ —— کے ساتھ رکھے گا۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اکثر فرماتے سنا ہے کہ میں اور ابوبکرؓ و عمرؓ گئے۔ میں اور ابوبکرؓ و عمرؓ داخل ہوئے۔ میں اور ابوبکرؓ و عمرؓ نکلے۔ اس بنا پر مجھے یقین ہے کہ اللہ آپ کو ان کے ساتھ رکھے گا۱؎" اور حضرت علیؓ نے فرمایا۲؎: "لوگو! میں تمہیں بتاتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت میں سب سے بہتر ابوبکرؓ تھے۔ ابوبکرؓ کے بعد سب سے بہتر عمرؓ تھے۔ اور اب ان کے بعد اللہ جہاں چاہے گا یہ فضیلت عطا فرما دے گا"

---

## (بقیہ رسائل و مسائل)

فاسد عناصر کے شر کو دفع کرنے، اور ان کے مقابلے میں نسبتہً صالح اور اسلامی نظام کے حامی عناصر کو آگے بڑھانے کے لیے جن امیدواروں کی تائید ناگزیر محسوس ہوگی ان کو ووٹ دینگے بھی اور دلوائیں گے بھی۔ اوپر میں نے اسلامی احکام کی جو تشریح کی ہے اسے دیکھ کر ہر معقول آدمی بیک نظر یہ محسوس کر لیگا کہ ہماری یہ نئی پالیسی ٹھیک دینی مزاج کے مطابق ہے اور اس میں درحقیقت کوئی اصول شکنی نہیں کی گئی ہے جو دین میں ممنوع ہو۔ مگر اس پر یہ طوفان اٹھا دیا گیا کہ تم اپنی خواہشات اور اغراض کے لیے خود اپنے ہی مانے ہوئے اصول توڑنے پر اُتر آئے ہو اور تمہارے پیشِ نظر اب بس اقتدار ہے جس کے لیے تم سب کچھ کر گزرو گے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ یہ باتیں علم اور فہم کی کمی کی وجہ سے کی جا رہی ہیں یا ان کے محرکات کچھ اور ہیں۔

---

۱؎ سیرۃ عمرؓ بن الخطاب لابن جوزی ۲؎ مسند احمد

# رسائل و مسائل

## طریقِ انتخاب کے مسئلے میں ریفرنڈم کی تجویز پر اعتراضات

سوال۔ طریقِ انتخاب کے مسئلے میں جماعت اسلامی نے ریفرنڈم کرانے کا جو مطالبہ کیا تھا اس پر مختلف حلقوں کی طرف سے مختلف اعتراضات کیے گئے ہیں۔ میں ان کا خلاصہ پیش کر کے آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کے پاس ان اعتراضات کا کیا جواب ہے۔

(۱) جداگانہ انتخاب اگر دین اور شریعت کے اصول اور احکام کا لازمی تقاضا ہے تو اس پر عوام سے استصواب کے کیا معنی؟ کیا اسی طرح کل نماز اور روزے پر بھی استصواب کرایا جائے گا؟ کیا آپ یہ اصول قائم کرنا چاہتے ہیں کہ عوام کی اکثریت جس چیز کو حق کہے وہ حق اور جس چیز کو باطل کہے وہ باطل؟ فرض کیجیے کہ ریفرنڈم میں اکثریت کا فیصلہ مخلوط انتخاب کے حق میں نکلے تو کیا آپ اس کو حق مان لیں گے اور پھر جداگانہ انتخاب اسلامی اصول و احکام کا تقاضا نہ رہے گا؟

(۲) جداگانہ اور مخلوط دونوں ہی طریقے غیر اسلامی ہیں، کیونکہ اسلام کی رُو سے تو مجلس شوریٰ میں غیر مسلم کی نمائندگی ہی اصولاً غلط ہے۔ آپ جب جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کرتے ہیں تو کیا اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آپ نے اسلامی ریاست کی مجلس شوریٰ میں غیر مسلم کی شرکت کا اصول مان لیا؟

(۳) استصواب رائے کی تجویز لا کر آپ نے طریقِ انتخاب کے مسئلے کو اس خطرے میں ڈال دیا ہے کہ شاید اس کا فیصلہ مخلوط انتخاب کے حق میں ہو۔ آخر آپ کے پاس اس امر کی کیا ضمانت ہے کہ اس کا نتیجہ لازماً جداگانہ طریقِ انتخاب ہی کے حق میں ہوگا؟

(۴) یہ عجیب بات ہے کہ آپ مخلوط انتخاب کے مخالف ہیں مگر طریقِ انتخاب کا فیصلہ مخلوط رائے شماری سے کرانے کے لیے تیار ہیں۔ آخر ریفرنڈم بھی تو مخلوط ہی ہوگا۔

(۵) آپ طریقِ انتخاب کے مسئلے پر ریفرنڈم کرانے کے بجائے یہ کیوں نہیں کرتے کہ آئندہ

انتخاباتِ عام میں اس مسئلے پر الیکشن لڑیں، اگر عوام الناس جداگانہ انتخاب کے حامی ہیں تو وہ انہی لوگوں کو ووٹ دینگے جو اس طریقِ انتخاب کے حامی ہونگے۔ اس طرح اس مسئلے کا تصفیہ ہو جائیگا۔

(۶) ریفرنڈم کے لیے ملک کے موجودہ دستور میں کوئی گنجائش نہیں ہے، اس لیے ناگزیر ہوگا کہ پہلے قومی اسمبلی اس مقصد کے لیے دستور میں ترمیم کرے۔ اور ترمیم کے لیے لامحالہ ۲/۳ اکثریت درکار ہوگی۔ سوال یہ ہے کہ جب مخلوط انتخاب کے قانون کو بدلنے کے لیے مجرد اکثریت بہم نہیں پہنچ رہی ہے تو ریفرنڈم کے لیے ۲/۳ اکثریت کہاں سے بہم پہنچے گی؟

(۷) جمہوری ممالک میں بالعموم ریفرنڈم کے ذریعہ سے ملکی مسائل کا فیصلہ کرنے کے بجائے پارلیمنٹ یا ایوانِ نمائندگان ہی کو آخری فیصلے کے اختیارات دیئے گئے ہیں۔ براہِ راست عوام سے مسائل کا تصفیہ کرانے میں بہت سی قباحتیں ہیں جن کی وجہ سے یہ طریقہ جمہوری ملکوں میں مقبول نہیں ہوا ہے۔

یہ ہیں وہ بڑے بڑے اعتراضات جو ریفرنڈم کی تجویز پر میں نے سنے یا پڑھے ہیں۔ ان سے کم از کم شک یا تذبذب کی کیفیت تو ذہنوں میں پیدا ہو ہی جاتی ہے، اس لیے مناسب ہوگا کہ آپ ان سب کو صاف کر کے عوام کو اس مسئلے میں پوری طرح مطمئن کر دیں۔

**جواب**۔ ان اعتراضات سے مجھ کو اپنے دوروں کے سلسلے میں متعدد مواقع پر سابقہ پیش آیا ہے اور میں نے اپنی تقریروں میں ان کے جوابات بھی دیئے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ مسلسل سفر کی وجہ سے تحریری صورت میں ان پر بحث کی نوبت نہ آسکی۔ اس تفصیلی سوالنامے کا جواب بھی بڑی تاخیر سے دیا جا رہا ہے

(۱) پہلا اعتراض جن اصحاب نے پیش فرمایا ہے ان کو شاید معلوم نہیں ہے کہ پاکستان کا نظام حکومت ابھی تک دین اور شریعت کے اصول و احکام پر قائم نہیں ہوا ہے، بلکہ یہ اس جمہوری دستور پر قائم ہے جو اکثریت کو فیصلہ کُن اختیار دیتا ہے۔ اگر کہیں یہ بات یہاں طے ہو چکی ہوتی کہ جو کچھ دین اور شریعت کی رو سے ثابت ہو وہی ملک کا قانون ہوگا تو پھر رونا ہی کس بات کا تھا۔ یہی ایک مسئلہ کیا معنی کسی مسئلے کو بھی دین کے منشا کے مطابق حل کرنے میں کوئی زحمت پیش نہ آتی جس مسئلے میں بھی دلائلِ شرعیہ سے ایک حکم ثابت کر دیا جاتا وہ خود بخود قانون بن جاتا اور اس کے خلاف جو قانون بھی ہوتا وہ آپ سے آپ منسوخ ہو جاتا۔ لیکن آخر یہ بات کس سے

چھپی ہوئی ہے کہ یہاں عملاً یہ صورتِ حال موجود نہیں ہے۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے نیشنل اسمبلی کی اکثریت نے مخلوط انتخاب۔ کا قانون پاس کیا اور وہ ملک۔ کا قانون بن گیا۔ اب اس قانون کو اگر بدلا جاسکتا ہے تو اکثریت ہی کے فیصلے سے بدلا جاسکتا ہے۔ ورنہ تمام علما مل کر بھی اگر متفقہ فتویٰ دے دیں کہ مخلوط انتخاب اسلام کے خلاف ہے تب بھی قانون اپنی جگہ پر قانون قائم رہیگا۔ ایسی حالت میں خواہ مخواہ خیالی باتیں کرنے سے کیا فائدہ؟ آپ طریقِ انتخاب۔ کے اس ملحدانہ قانون کو واقعی بدلوانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے وہ طریقہ اختیار کیجیے جو موجودہ جمہوری نظام میں ممکن العمل اور مؤثر ہوسکتا ہے۔ ایسا نہ کریں گے تو حاصل اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ آپ دلائل و براہین کے انبار لگاتے رہیں گے اور انتخابات مخلوط بنیاد پر ہوتے رہیں گے۔

یہ کہنا کہ کیا کل نماز اور روزے پر بھی ریفرنڈم کرایا جائیگا، ایک اور بے خبری کی دلیل ہے۔ ان حضرات کو یہ معلوم نہیں ہے کہ یہاں آج نماز اور روزے کی جو آزادی حاصل ہے وہ بھی اس بنا پر نہیں ہے کہ شریعت سے یہ احکام ثابت ہیں، بلکہ صرف اس بنا پر ہے کہ دستور نے بنیادی حقوق کے سلسلے میں باشندوں کو اپنے اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرنے کا حق دیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ملک کی مجالس قانون ساز اکثریت کے ووٹ سے نماز اور روزے کے احکام میں بھی ردو بدل کرسکتی تھیں، اور اس کے ایسے قوانین سے نجات پانے کی کوئی سبیل اس کے سوا نہ ہوسکتی تھی کہ یا تو بغاوت کیجیے، ورنہ جمہوری طریقے سے فیصلہ کرانے کے لیے ریفرنڈم کا مطالبہ کیجیے

مجلس قانون ساز کے فیصلے اور ریفرنڈم کے فیصلے میں درحقیقت اصولی حیثیت سے کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں جگہ اکثریت ہی کا فیصلہ مؤثر ہوتا ہے۔ فرق صرف عملی صورت کا ہے۔ ایک جگہ مجلسِ قانون ساز کے ارکان کی اکثریت فیصلہ کرتی ہے اور دوسری جگہ ملک کے عام باشندوں کی اکثریت۔ اب یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جو لوگ مجالسِ قانون ساز کے معاملے میں اکثریت کے اختیاراتِ قانون سازی کو مانے بیٹھے ہیں وہ عوام کی اکثریت کے اختیار کا نام سن کر شور مچانے لگتے ہیں۔

ریفرنڈم کے متعلق یہ بات بھی ان حضرات کو معلوم نہیں ہے کہ وہ حق اور باطل کا فیصلہ کرنے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ یہ فیصلہ کرنے کے لیے ہوتا ہے کہ ملک کا قانون کیا ہو اور کیا نہ ہو۔ جس چیز کو ہم باطل سمجھتے

ہیں اگر ریفرنڈم میں اکثریت کا فیصلہ اس کی تائید میں ہو جائے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم اسے حق مان لیں گے، بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ ملک کا قانون وہ چیز قرار پائیگی جس کی تائید میں اکثریت نے فیصلہ دیا ہے۔ ہمیں اس کے بعد بھی یہ حق حاصل رہے گا کہ اسے باطل کہیں، اس کے بطلان پر دلائل لائیں، اور عوام کی رائے کو اس کے خلاف تیار کرتے رہیں، یہاں تک کہ عوام ہی کی اکثریت کو فیصلہ بدلنے پر راضی کر لیں۔ آخر اب جو اکثریت کے فیصلے سے ملک کی اسمبلیوں میں قوانین بنتے ہیں ان میں سے کس قانون کا بن جانا یہ معنی رکھتا ہے کہ اقلیت نے اس کو حق مان لیا اور اس کے خلاف اپنی رائے کو باطل تسلیم کر لیا؟

(۲) دوسرا اعتراض جن لوگوں نے پیش کیا ہے ان کی پوزیشن بھی عجیب ہے۔ جب دستور میں غیر مسلموں کو نمائندگی کا حق دیا گیا اس وقت وہ خاموش رہے۔ جب مخلوط انتخاب کا قانون پاس ہوا اس وقت بھی وہ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہے۔ آج بھی غیر مسلموں کے حق نمائندگی کو دستور سے منسوخ کرانے کے لیے وہ کوئی ایجی ٹیشن نہیں فرما رہے ہیں۔ یہ نکتہ ان کو صرف اس وقت سوجھتا ہے جب جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ بات خود واضح ہو جاتی ہے کہ دراصل یہ اپنے مخصوص پیشواؤں کی پیروی میں مسلم و غیر مسلم کی متحدہ قومیت کے قائل ہیں اور ان کے پیش نظر صرف یہ ہے کہ کسی طرح مخلوط انتخاب یہاں رائج ہو جائے۔ غیر مسلم کے حق نمائندگی کا انکار صرف ایک بہانہ ہے جو اپنی اغراض کے لیے انہوں نے استعمال کرنا شروع کیا ہے، ورنہ یہ تماشہ کیا ہے کہ اپنے ان پیشواؤں کے متعلق ان کی کیا رائے ہے جنہوں نے ہندوستان میں لادینی ریاست کے قیام کی حمایت فرمائی تھی۔

رہا ان کا اصل اعتراض، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے مخلوط اور جداگانہ انتخاب کی حیثیت ہرگز یکساں نہیں ہے۔ مخلوط انتخاب کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ ایک ملک کے رہنے والے تمام باشندے، خواہ وہ مسلم ہوں یا ہندو یا عیسائی یا پارسی، سب ایک قوم ہیں، ملک کی حکومت اس "واحد قومیت" کی مشترک حکومت ہے، اور اسے چلانے کا کام ان لوگوں کے سپرد ہونا چاہیے جو بلا امتیاز دین و مذہب "اس قوم" کے تمام افراد کے مشترک نمائندے ہوں۔ یہ نظریہ سرے سے اسلامی ریاست ہی کے تصور کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ اس پر جو نظام حکومت قائم ہوگا وہ لازماً صرف لادینی ہوگا۔ اس میں اسلام اور دوسرے مذاہب ایک سطح پر آجائیں گے اور ان میں سے کسی کو بھی ملک کے معاملات میں دخل دینے کا حق نہ ہوگا۔ اس کی اسمبلیوں میں منتخب

ہو کر آنیوالے نمائندے اپنی شخصی حیثیت میں خواہ مسلم یا ہندو یا عیسائی ہوں، مگر نمائندہ ہونے کی حیثیت سے وہ صرف پاکستانی قوم" کے نمائندے ہونگے اور ان کو کسی مذہب یا مذہبی گروہ کی طرف سے بولنے کا حق نہ ہوگا۔ اس کے بعد یہاں موجودہ دستور کی اُن دفعات کے بھی باقی رہنے کا کوئی امکان نہیں ہے جنہیں ہم اسلامی دفعات کہتے ہیں، کجا کہ یہاں کبھی کوئی حقیقی معنوں میں اسلامی حکومت قائم ہونے کی امید کی جا سکے۔ اب کون صاحب عقل آدمی کہہ سکتا ہے کہ یہ نظریہ اور جداگانہ انتخاب کا نظریہ دونوں اسلامی نقطۂ نظر سے برابر کی حیثیت رکھتے ہیں؟ جداگانہ انتخاب قومیت کی بنیاد دین پر رکھتا ہے اور اس سے مسلمانوں کی مستقل قومیت برقرار رہتی ہے۔ اس کے ذریعہ سے مسلمان نمائندے صرف مسلمانوں کی رائے سے منتخب ہونگے اور وہ اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے بولنے کے مجاز ہونگے۔ ان نمائندوں کی اکثریت اگر اسلامی ذہنیت رکھنے والی ہو تو وہ موجودہ دستور کی دی ہوئی گنجائشوں سے فائدہ اٹھا کر نظام حکومت کو اسلام کی راہ پر چلا سکے گی اور اس صورت میں ہر وقت یہ ممکن ہوگا کہ دستور کو بھی بدل کر پورا پورا اسلامی بنا دیا جائے۔ اس نظام میں زیادہ سے زیادہ اگر کوئی قباحت ہے تو صرف یہ کہ اس کے اندر غیر مسلم نمائندے بھی قانون سازی اور حکومت کی رہنمائی میں حصہ دار ہونگے۔ اس چیز کی اصلاح اس صورت میں تو کسی نہ کسی وقت ہو سکے گی جبکہ نظام حکومت کی بنیاد اسلامی رہے۔ لیکن مخلوط وطنی قومیت کا نظریہ قائم ہو جانے کے بعد تو سرے سے یہ بنیاد ہی باقی نہ رہیگی۔

(۳) تیسرا اعتراض صرف ایک واہمہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر پورے ملک میں طریق انتخاب کے مسئلے پر استصواب ہو جائے تو مخلوط انتخاب کے حق میں فیصلہ ہونے کا ایک فی صد بھی امکان نہیں ہے۔ جہاں تک مغربی پاکستان کا تعلق ہے، یہاں ہر شخص جانتا ہے کہ عوام اور خواص کی بڑی عظیم اکثریت اس طریق انتخاب کی سخت مخالف ہے، حتیٰ کہ اُن لوگوں کے خلاف یہاں شدید نفرت پائی جاتی ہے جو اس لعنت کو پاکستان میں لانے کے موجب ہوئے ہیں۔ رہا مشرقی پاکستان، تو اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ وہاں مسلمانوں کی رائے کم از کم ۹۰ فی صدی جداگانہ انتخاب کے حق میں ہے، اور اب تو وہاں کے عوام ہی نہیں تعلیم یافتہ طبقے کی اکثریت بھی مخلوط انتخاب کی مخالف ہو چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود غرض سیاسی لیڈر جو محض اپنے اقتدار کے لیے سودے بازی کر کے اس ملعون طریق انتخاب کو رائج کرنے کے ذمہ دار ہیں، ریفرنڈم کا نام سنتے ہی کانپ اُٹھتے ہیں، کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ورنہ اگر ریفرنڈم میں اُن کے جیتنے کا کچھ بھی امکان ہوتا تو وہ اس چیلنج کا سامنا کرنے سے یوں نہ گھبراتے۔

(۴) چوتھے اعتراض کو پیش کرنے والے حضرات شاید اس غلط فہمی میں ہیں کہ یہاں غیر مسلموں کو ووٹ دینے کا حق

حاصل نہ تھا اور اب یہ بات ہم نے بطورِ خود تجویز کر دی ہے کہ ریفرنڈم میں ان کی رائے بھی لی جائے۔ حالانکہ ملک کا دستور پہلے ہی یہ حق ان کو دے چکا ہے اور اس دستور کے تحت جو رائے شماری بھی کسی ملکی مسئلے پر ہوگی اس سے ان کو الگ نہ کیا جا سکے گا۔

(۵) انتخاباتِ عام سے پہلے جس بنا پر ہم طریقِ انتخاب کے مسئلے کا فیصلہ ریفرنڈم کے ذریعے سے کرانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو لامحالہ ملک کے پہلے انتخابات مخلوط بنیاد ہی پر ہوں گے، اور اس طریقِ انتخاب کی تبدیلی صرف انتخابات کے بعد ہی ہو سکے گی جس کا کوئی فائدہ دوسرے انتخابات کی نوبت آنے تک مترتب ہو سکے گا۔ اب یہ بات ہم مشرقی پاکستان کے حلقہ ہائے انتخاب کا پورا تجزیہ کر کے ناقابلِ تردید اعداد و شمار سے ثابت کر چکے ہیں کہ پہلا ہی انتخاب جو مخلوط بنیاد پر ہوگا اس کی بدولت وہاں ایسے لوگ بڑی تعداد میں منتخب ہو کر آجائیں گے جو بنگالی قوم پرستی کے نشے میں سرشار ہیں اور آج بھی متحدہ بنگال کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ یہ لوگ اگر وہاں طاقت پکڑ گئے تو دوسرے انتخاب کی نوبت آنے سے پہلے ہی چند سال کے اندر وہ پاکستان کی وحدت و سالمیت پر ایک کاری ضرب لگا چکے ہوں گے۔ اس خطرے کو جو لوگ برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں انہیں اختیار ہے کہ ریفرنڈم کی مخالفت کر کے مخلوط بنیاد پر انتخاباتِ عام منعقد کرانے کی راہ ہموار کرتے رہیں۔ لیکن جو لوگ اس کے خطرناک نتائج کا کوئی احساس رکھتے ہیں ان کی پوزیشن سمجھنے سے ہم بالکل قاصر ہیں۔

(۶) چھٹا اعتراض ہمارے نزدیک دستوری پوزیشن سے سراسر ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ طریقِ انتخاب پر ریفرنڈم کرانے کے لیے دستور میں کسی ترمیم کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، کیونکہ دستور کی کوئی دفعہ اس خاص مسئلے پر یا کسی ملکی مسئلے پر بھی ریفرنڈم کرانے میں مانع نہیں ہے جسے بدلے بغیر یہ کام نہ کیا جا سکتا ہو۔ دستور نے طریقِ انتخاب کا فیصلہ کرنے کے لیے نیشنل اسمبلی کو صرف ایک دفعہ دونوں صوبائی اسمبلیوں سے رائے لے لینے کا پابند کیا تھا۔ سو یہ شرط پوری کی جا چکی ہے۔ اس پابندی کا تقاضا پورا ہو جانے کے بعد اب اس اسمبلی پر کوئی پابندی نہیں ہے جسے رفع کرنے کے لیے کسی دستوری ترمیم کی حاجت ہو۔ اور اس پابندی کو کسی ہیر پھیر سے بھی یہ معنی نہیں پہنائے جا سکتے کہ نیشنل اسمبلی دونوں صوبائی اسمبلیوں سے رائے لینے کے علاوہ اگر کسی اور ذریعے سے بھی رائے عام معلوم کرنے کی ضرورت محسوس کرے تو دستور ایسا کرنے میں مانع ہے۔ اس لیے یہ اسمبلی جب چاہے ریفرنڈم کرانے کے لیے مجرد اکثریت سے ایک قانون پاس کر سکتی ہے۔

(۷) ساتویں اعتراض میں اوّل تو یہی بات غلط کہی گئی ہے کہ جمہوری ممالک میں بالعموم ریفرنڈم کا طریقہ رائج نہیں ہے۔ یہ بات صرف ان ممالک کے حق میں صحیح ہے جو برطانوی جمہوریت کے نقّال یا فرانسیسی طرزِ جمہوریت کے مقلّد ہیں۔ باقی رہے دوسرے جمہوری ممالک تو ان میں یہ طریقہ بالعموم رائج ہے۔ سوئٹزرلینڈ تو اس معاملہ میں مشہور ہی ہے۔ اس کے علاوہ آسٹریلیا، کینیڈا، نیوزی لینڈ اور آئرش فری اسٹیٹ کے دستوروں میں بھی اس کے متعلق واضح دفعات موجود ہیں۔ آسٹریلیا میں ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۵ء تک ۱۲ مرتبہ اور نیوزی لینڈ میں ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۶ء تک ۶ مرتبہ ریفرنڈم ہو چکا ہے۔ کینیڈا میں بھی کئی مرتبہ دستوری مسائل پر ریفرنڈم ہوا ہے اور لوکل گورنمنٹ کے مسائل کا فیصلہ کرنے کے لیے تو وہاں کثرت سے یہ طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ یورپ میں آسٹریا، جرمنی، اسٹونیا، لیتھوانیا، لٹویا اور چیکوسلواکیا کے جمہوری دستور ریفرنڈم کے متعلق اہم دفعات پر مشتمل ہیں۔ امریکہ کی دو ریاستوں کے سوا باقی تمام ریاستوں میں دستوری مسائل پر ریفرنڈم کرانے کا طریقہ رائج ہے، اور قانونی امور پر بھی ۲۰ ریاستوں میں ریفرنڈم کرایا جا سکتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا بالکل خلافِ واقعہ ہے کہ جمہوری ممالک میں بالعموم پارلیمنٹ یا ایوانِ نمائندگان ہی کو فیصلے کے آخری اور قطعی اختیارات دے دیئے گئے ہیں اور عوام کو قوانین بنانے یا بدلنے کے ہر اختیار سے محروم کر کے رکھ دیا گیا ہے۔

رہی یہ بات کہ عوام سے مسائل کا تصفیہ کرانے میں کچھ قباحتیں ہیں جن کی وجہ سے یہ طریقہ جمہوری ملکوں میں مقبول نہیں ہوا ہے، تو درحقیقت یہ بھی ایک دعویٰ ہے جو ناواقفیت کی وجہ سے کر دیا گیا ہے، ورنہ اصل معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ایوانِ نمائندگان کو آخری اور قطعی اختیارات دے دینے میں کچھ ایسی قباحتیں ہیں جن کا تجربہ کرنے کے بعد جمہوری ممالک میں ریفرنڈم کے طریقے کو مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ امریکہ میں اس طریقے کا رواج بیسویں صدی کے آغاز سے ہوا ہے اور اس کی وجہ ایک ماہرِ دستوریات یہ بیان کرتا ہے:

> "ممالکِ متحدہ امریکہ میں عوام کی طرف سے براہِ راست قانون سازی کا طریقہ رائج ہونے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ لوگ اپنی ریاستوں کے ارکان مجالسِ قانون ساز کی کارگزاری سے غیر مطمئن ہو گئے ہیں۔ قابلِ اعتماد قیادت کا فقدان، مخصوص مفادات رکھنے والوں کا ارکانِ مجالس سے مل جل کر ان کی رائے پر اثر انداز ہونا، اور بعض بڑے بڑے سیاسی اجارہ داروں کا وقتاً فوقتاً قانون ساز مجالس پر حاوی ہو جانا، یہ وہ چیزیں ہیں جنہیں دیکھ دیکھ کر انیسویں صدی کے آخری دور میں لوگ اپنے قانون سازوں سے غیر مطمئن ہوتے چلے گئے۔ لوگوں نے محسوس کیا کہ اگر ہم براہِ راست کام کریں تو اس سے بدتر کارگزاری تو نہ دکھائیں گے، بلکہ شاید اس سے بہتر ہی کر دکھائیں۔ اس بنا پر انہوں نے قوانین بنانے اور مجالسِ قانون ساز کے بنائے ہوئے قوانین کو رد کرنے کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے،

نہ اس غرض کے لیے روزمرہ کے معاملات میں بالعموم وہ یہ کام کیا کریں، بلکہ صرف اس غرض کے لیے کہ جب کسی دوسرے ذریعہ سے نتیجۂ مطلوب حاصل نہ ہو تو اس ذریعہ کو استعمال کیا جائے۔" (انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز جلد ۵، صفحہ ۱۵۱)

اب ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ ہمارے ہاں اس آخری چارہ کار کے اختیار کرنے کی ضرورت امریکہ، اور دنیا کے ہر دوسرے ملک سے زیادہ ہے۔ جہاں کھلی کھلی دھاندلیوں اور جعلسازیوں اور زرپاشیوں سے کچھ لوگ زبردستی ایوانِ نمائندگان میں پہنچے ہوں، جہاں بڑے بڑے بااثر لوگ چور دروازوں سے پارلیمنٹ میں داخل ہوئے ہوں، جہاں سازشیں اور سودے بازیاں کرکے نہایت نازک اور اہم ملکی مسائل کے متعلق ایسے قوانین بنائے جاتے ہوں جن کا اصل مقصود بس چند لوگوں کو برسرِ اقتدار رکھنا ہو، اور جہاں حالت یہ ہو کہ ایک طرف سارا ملک چیخ رہا ہے اور دوسری طرف قانون سازی کے اجارہ دار اپنی من مانی کیے جا رہے ہیں، ایسی جگہ تو عوام کے لیے ان بددیانت قانون سازوں کی زیادتیوں سے نجات پانے کا یہ راستہ لازماً کھلنا چاہیے کہ جو قانون ان کی مرضی کے خلاف اور ان کے احتجاج کے علی الرغم بنایا گیا ہو اسے وہ ریفرنڈم کے ذریعہ سے بدل سکیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ جو لوگ جمہوریت پسندی کے دعوے کرتے ہیں وہ آخر کس منہ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ناجائز ہتھکنڈوں سے برسرِ اقتدار آنے والے لوگ چند سال کے لیے ملک میں مختارِ کل بنا کر بٹھا دیئے جائیں اور وہ اپنی اغراض کے لیے خواہ کیسے ہی ناروا قوانین بنا بیٹھیں، عوام کے پاس ان کے فیصلے بدلوانے کا کوئی اختیار نہ ہو۔

---

# کیا اسلام کے سب اصول بے لچک ہیں؟

سوال: آپ نے ربیع الثانی ۱۳۷۶ھ (دسمبر ۱۹۵۶ء) کے ترجمان میں کسی صاحب کے دو مکتوبات کا جواب دیا ہے جن میں آپ نے لکھا ہے: "ہم اپنی تحریک کو خلا میں نہیں چلا رہے ہیں بلکہ واقعات کی دنیا میں چلا رہے ہیں۔ اگر ہمارا مقصد محض اعلانِ حق ہوتا تو ہم ضرور صرف بے لاگ حق بات کہنے پر اکتفا کرتے، لیکن ہمیں چونکہ حق کو قائم بھی کرنے کی کوشش کرنی ہے اور اس کے لیے اسی واقعات کی دنیا میں سے راستہ نکالنا ہے اس لیے ہمیں نظریت (آئیڈیلزم) اور حکمتِ عملی کے درمیان توازن برقرار رکھتے ہوئے چلنا پڑتا ہے"... "حکمتِ عملی ہی یہ طے کرتی ہے کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے راستے کی کن چیزوں کو آگے پیش قدمی کا ذریعہ بنانا چاہیے، کن کن موانع سے فائدہ اٹھانا چاہیے، کن کن موانع کے ہٹانے کو مقدم اہمیت دینی چاہیے اور اپنے اصولوں میں سے کن میں بے لچک ہونا اور کن میں اہم تر مصالح کی خاطر حسبِ ضرورت لچک کی گنجائش نکالنا چاہیے۔"

آئیڈیلزم اور حکمتِ عملی کے درمیان توازن برقرار رکھنے اور بعض اہم تر مصالح یا دینی مقاصد کی خاطر بعض اصولوں میں لچک پیدا کرنے کی مثال آپ نے سنتِ نبویؐ سے یہ پیش کی ہے "اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں ... لیکن جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آنحضورؐ نے ہدایت دی کہ الائمۃ من قریش (امام قریش میں سے ہوں)۔" اس استثناء کی توجیہ آپ نے یہ کی ہے کہ "اس وقت عرب کے حالات میں کسی غیر عرب تو درکنار کسی غیر قریشی خلیفہ کی خلافت بھی عملاً کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے حضورؐ نے خلافت کے معاملے میں مساوات کے اس عام اصول پر عمل کرنے سے صحابہ کو روک دیا کیونکہ اگر عرب ہی میں حضورؐ کے بعد اسلامی نظام درہم برہم ہو جاتا تو دنیا میں اقامتِ دین کے فریضہ کو کون انجام دیتا؟ یہ اس بات کی صریح مثال ہے کہ ایک اصول کو قائم کرنے پر ایسا اصرار جس سے اس اصول کی بہ نسبت بہت زیادہ اہم دینی مقاصد کو نقصان پہنچ جائے حکمتِ عملی ہی نہیں حکمتِ دین کے بھی خلاف ہے۔" اس کے بعد آپ نے لکھا ہے "مگر یہ معاملہ اسلام کے سارے اصولوں کے بارے میں صحیح نہیں ہے۔ جن اصولوں پر دین کی اساس قائم ہے، مثلاً توحید اور رسالت وغیرہ، ان میں عملی مصالح کے لحاظ سے لچک پیدا کرنے کی کوئی مثال حضورؐ کی سیرت میں نہیں ملتی، نہ اس کا تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔"

بعض لوگوں نے آپ کے ایسے اقتباسات نقل کر کے ان سے بعض نتائج اخذ کیے ہیں اور پھر آپ پر بعض اعتراضات وارد کیے ہیں۔ مثلاً ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ "جو فکر و فلسفہ تحریکِ اقامتِ دین کے نام سے سید المرسل کی جانب منسوب کیا جا رہا ہے، اس کا تجزیہ کیجیے تو صورتِ واقعہ یوں بنتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی نظام قائم کرنے کی تحریک جاری فرمائی اور اس کے چند اصول بیان فرمائے۔ ان میں سے بعض تو وہ تھے جن کا تعلق ایمانیات سے تھا، مثلاً ایمان باللہ، ایمان بالرسالت وغیرہ ... حضورؐ کی پوری زندگی میں کوئی مثال ایسی نہیں ملتی جس سے ان اصولوں میں لچک اور استثناء کا ثبوت پیش کیا جا سکے۔ لیکن ان کے ساتھ کچھ دوسری قسم کے اصول بھی آنحضورؐ نے پیش فرمائے۔ مثلاً جو اسلامی نظام میں قائم کروں گا اس میں ہر اسود و ابیض اور عربی و عجمی کا درجہ مساوی ہوگا، سب کو جان و مال اور عزت و آبرو کی آزادی حاصل ہوگی وغیرہ ... لوگوں نے ان اصولوں کو مفید محسوس کیا اور اپنی خدمات اسلامی نظام کے قیام کے لیے پیش کر دیں ... بالآخر وہ لمحہ آیا کہ یہ نظام عملاً قائم ہو۔ اس مرحلہ پر قائدِ تحریک محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طرزِ عمل اختیار فرمایا وہ یہ تھا کہ آپ نے اپنی تحریک کے آغاز میں لوگوں کے سامنے جو

آئیڈیل پیش فرمایا تھا، اس کے ان اصولوں کو جو اول الذکر قسم (ایمانیات) کے اصولوں سے الگ تھے (مثلاً مساوات، شخصی آزادی، جان و مال کی حفاظت وغیرہ) ان کے بارے میں طے فرما دیا کہ ان میں سے جو اصول حکمتِ عملی سے متصادم ہونگے، یعنی جن پر عمل پیرا ہونے سے اقامتِ دین کی تحریک کو نقصان پہنچے گا، ان میں استثناء اور لچک پیدا کر لی جائے گی۔"

مزید تحلیل و تجزیہ کرتے ہوئے آپ کا موقف یہ قرار دیا گیا ہے گویا کہ آپ نے اس اصول کو بطور فلسفہ و عقیدہ کے طے کر لیا ہے کہ اسلامی نظام کے دعوتی اور اشاعتی دور میں جو اصول بیان کیے جائیں اور جن پر لوگوں کو جمع کیا جائے، جب اسلامی نظام قائم کرنے کا وقت آئیگا تو اس تحریک کے قائد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ توحید و رسالت ایسے اساسی اصولوں کے سوا تحریک کے مفاد کے لیے جس اصول میں ضروری خیال کرے استثناء پیدا کر لے، اس پر عمل کرنے سے اپنی جماعت کو روک دے اور جو ضمانات اس تحریک نے عوام کو ابتدائی دور میں دی ہو، اس میں سے جس جزو کو وہ دین کی مصلحت کے لیے مضر خیال کرے، ساقط کر دے۔"

آپ کا یہ مسلک متعین کرنے کے بعد انہی مکتوبات سے آپ کا ایک دوسرا اقتباس بھی دیا گیا ہے جس میں آپ نے کہا ہے کہ "ہم اسلام کے موجد تو نہیں ہیں کہ اپنی مرضی سے جیسا چاہیں پروگرام بنائیں اور دعوتِ اسلامی کا مفاد جس طریقہ میں ہم کو نظر آئے اس کو اختیار کر لیں۔" اس اقتباس سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ آپ کے بیان میں تضاد و تناقض ہے اور آپ کا رویہ ایک معمّا بن گیا ہے۔ پھر یہ حضرات اس معمے کو حل کرنے اور بقولِ خویش اس کے پس منظر میں آپ کے ذہن کی گہرائیوں کو پڑھنے کی بھی کوشش کرتے ہیں اور آخرکار یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ آپ پہلے کبھی اسلام کے ساتھ اخلاص کا معاملہ کرتے رہے ہوں تو کرتے رہے ہوں مگر پاکستانی سیاسیات میں حصہ لینے کے بعد آپ اسلام کو اپنے ذاتی اور جماعتی اغراض پر قربان کرنے کے درپے ہیں۔ چنانچہ ایک طرف آپ مکمل اسلامی دستور کے مطالبے کی کامیابی سے مایوس ہیں مگر دوسری طرف مسندِ حکومت پر پہنچنے کے بھی متمنی ہیں، اس لیے اپنے اُس اصول کو برقرار رکھنے کے لیے کہ "جس حکومت کا دستور ایسا اور ایسا نہ ہو اس میں حصہ نہیں لیا جا سکتا" آپ نے اصولوں میں لچک پیدا کرنے کا نظریہ پیش کر دیا ہے۔ اسی طرح آپ کی جداگانہ انتخاب کی حمایت کا سبب بھی یہی بیان کیا گیا ہے کہ مخلوط انتخاب میں آپکا اور آپ کی جماعت کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ اس وجہ سے آپ اس

معاملہ میں اسلام کے اصولوں کا سہارا لیتے ہیں۔

جو لوگ حال ہی میں جماعت اسلامی سے الگ ہوئے ہیں ان کی علٰحدگی کی اصل بنیاد بھی یہی بیان کی گئی ہے کہ اُن کے احساس کے مطابق بھی آپ کے سامنے اب مسئلہ صرف اقتدار حاصل کرنے کا ہے اور اس مقصد کے لیے آپ جس وقت جو پالیسی مناسب سمجھیں اختیار کرنے پر آمادہ ہیں چاہے وہ اسلام کے اصولوں کے کتنے ہی خلاف ہو نیز اگر ضرورت پڑے تو آپ اسلامی اصولوں کی من مانی تشریح کرنے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ ان لوگوں کے بقول آپ کی اسلامی تحریک اور ان طالع آزما سیاست دانوں کی تحریکات کے مابین کوئی فرق نہیں ہے جو حصول اقتدار سے پہلے نہایت پاکیزہ اصول بیان کرتے ہیں لیکن جب انہیں اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو وہ ان وعدوں اور اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور اسلام کے اصولوں میں وقتی مصالح کی بنا پر اپنی صوابدید کے مطابق ترمیم و تنسیخ جائز سمجھتے ہیں۔

بہرکیف اس طرح کی بحثیں اور اعتراضات چونکہ پیدا کیے جا رہے ہیں اور ان سے بکثرت لوگ غلط فہمیوں میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ اس لیے یہ بہت مناسب بلکہ ضروری ہے کہ آپ ایک مرتبہ اچھی طرح وضاحت کر دیں کہ آپ کی زیر بحث تحریروں کا صحیح مدعا کیا ہے اور جماعت کی پالیسی کے خلاف جو اعتراضات پھیلائے گئے ہیں ان کی حقیقت کیا ہے۔

جواب: میری مذکورۂ بالا تحریروں پر جو حاشیہ آرائیاں کی گئی ہیں وہ سب میری نگاہ سے گزرتی رہی ہیں مگر میں نے اُن پر اُسی طرح صبر کیا جس طرح اس سے پہلے بہت سے حضرات کے فتووں، اشتہاروں اور رسالوں پر صبر کرتا رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے جو تھوڑی سی مُہلتِ عمر اور قوتِ تحریر و تقریر مجھے عطا فرمائی ہے اس کو میں کسی مفید کام میں صرف کرنا چاہتا ہوں تاکہ دنیا میں اس سے خدا کے دین کی کچھ خدمت ہو جائے اور آخرت میں وہ میرے گناہوں کا کفارہ بن سکے۔ میرے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ اس فداسے وقت اور اس تھوڑی سی قوت کو ایسی بحثوں میں ضائع کروں جن کا کوئی حاصل دنیا میں دین اور اہل دین کی رسوائی اور آخرت میں نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کی بازپرس کے سوا کچھ نظر نہ آتا ہو۔ اس وقت بھی میرے پیش نظر ان حاشیہ آرائیوں کا جواب دینا نہیں ہے جو میری ان تحریروں پر کی گئی ہیں بلکہ صرف اپنا مدعا واضح کرنا ہے، تاکہ اگر کوئی اللہ کا بندہ ان سے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا ہو تو اس کے دل کا وسوسہ دور ہو جائے۔

ان عبارتوں سے میرا مدعا جو کچھ ہے اسے سمجھنے کے لیے وہی ایک فقرہ کافی ہے جو خود ان نقل کردہ عبارتوں میں موجود ہے

"ایک اصول کو قائم کرنے پر ایسا اصرار جس سے اس اصول کی بہ نسبت بہت زیادہ اہم دینی مقاصد کو نقصان پہنچ جائے، حکمتِ عملی ہی نہیں حکمتِ دین کے بھی خلاف ہے۔"

اس فقرے پر جو شخص بھی تعصب اور نفسانیت سے بے لوث ہو کر غور کریگا وہ میرا مطلب سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ نظری حیثیت سے تو ہر صحیح اصول قائم کرنے کے لیے اور ہر غلط چیز ترک کرنے اور مٹا دینے کے لائق ہے، لیکن عملی زندگی میں خیر و شر کی کشمکش کے درمیان انسان کو بہت سے مواقع پر ایسے حالات سے بھی سابقہ پیش آجاتا ہے جن میں ایک چھوٹی بھلائی پر اصرار کرنے سے ایک بڑی بھلائی کا نقصان ہوتا ہے، یا ایک چھوٹی برائی ترک کرنے سے ایک بڑی برائی لازم آتی ہے۔ ایسے مواقع پر عقل بھی یہ چاہتی ہے کہ ایک کم قیمت چیز پر زیادہ قیمتی چیز کو قربان نہ کیا جائے، اور شریعتِ الٰہیہ میں جو حکمت معتبر ہے اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ بڑی برائی سے بچنے کے لیے چھوٹی برائی کو گوارا کیا جائے اور چھوٹی بھلائی کی خاطر بڑی بھلائی کو نقصان نہ پہنچنے دیا جائے۔ اس معاملے میں میں صرف عقل کو کسوٹی بنانے کا قائل نہیں ہوں کہ آدمی جب چاہے عملی ضروریات کی بنا پر اسلام کے اصول و قواعد اور احکام میں سے جس کی بندش سے چاہے نکل جائے، بلکہ یہ بات میرے اسی فقرے سے ظاہر ہے کہ میں اس حکمت کا قائل ہوں جو خود اسلام کے دیئے ہوئے معیار سے جانچ کر یہ دیکھتی ہے کہ کس چیز کی خاطر کس چیز کو کہاں اور کس حد تک قربان کرنا ناگزیر ہے۔

اب دیکھیے کہ آیا یہ کوئی میری اپنی من گھڑت بات ہے یا فی الواقع شریعت کے نظام میں اس کے اپنے سکھائے ہوئے اصول و قواعد اور احکام کے درمیان قیمتوں کا فرق ہے اور کوئی ایسا قاعدہ پایا جاتا ہے جس کے لحاظ سے کم قیمت چیز کو بڑی قیمت کی چیز پر قربان کرنا جائز ہو۔ اس کی مثالیں اگر قرآن، حدیث، آثارِ صحابہ اور فقہاء و محدثین کی تصریحات میں تلاش کی جائیں تو ان کا شمار مشکل ہوگا۔ میں یہاں صرف چند مثالیں پیش کرونگا۔

(۱) اسلام میں توحید کے اقرار کی جیسی کچھ اہمیت ہے کسی جاننے والے سے پوشیدہ نہیں۔ یہ حق پرستی کا اولین تقاضا اور ہر مومن سے دین کا سب سے پہلا مطالبہ ہے۔ نظری حیثیت سے دیکھا جائے تو اس معاملہ میں قطعاً کسی لچک کی گنجائش نہ ہونی چاہیے۔ ایک مومن کا کام یہ ہے کہ چاہے اس کے گلے پر چھری رکھ دی جائے اور خواہ اس کی بوٹیاں کاٹ ڈالی جائیں، وہ توحید کے اقرار و اعلان سے ہرگز نہ پھرے۔ مگر قرآن ایسے حالات میں جبکہ ایک شخص کو ظالموں سے

جان کا خطرہ لاحق ہو جائے، یا ایسے ناقابلِ برداشت اذیت دی جائے، کلمۂ کفر کہہ کر بچ جانے کی اجازت دیتا ہے بشرطیکہ وہ دل میں عقیدۂ توحید پر قائم رہے (مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ النحل، رکوع ۱۴)۔ یہ چاہے عزیمت کا مقام نہ ہو، مگر رخصت کا مقام ضرور ہے، اور یہ رخصت اللہ تعالیٰ نے خود عطا فرمائی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شریعت کی نگاہ میں مسلمان کی جان کی قیمت اقرارِ توحید سے زیادہ ہے، حتیٰ کہ اگر ان دونوں میں سے ایک کو قربان کرنا ناگزیر ہو جائے تو شریعت اقرارِ توحید کی قربانی گوارا کر سکتی ہے لیکن کیا جان بچانے کے لیے کفر کی تبلیغ بھی کی جا سکتی ہے؟ کسی دوسرے مسلمان کو قتل بھی کیا جا سکتا ہے؟ اسلامی حکومت کے خلاف جاسوسی کی خدمت بھی انجام دی جا سکتی ہے؟ اس کا جواب لازماً نفی میں ہے۔ کیونکہ یہ اپنی جان کی قربانی کی بہ نسبت بہت زیادہ قیمتی چیزوں کی قربانی ہو گی جس کی اجازت کسی حال میں نہیں دی جا سکتی۔

(۲) اسلام میں شراب، خنزیر، مردار، خون، اور مَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کو اسی طرح قطعاً حرام کیا گیا ہے جس طرح زنا، چوری، ڈاکے اور قتل کو حرام کیا گیا ہے۔ لیکن اضطرار کی حالت پیدا ہو جائے تو جان بچانے کے لیے پہلی قسم کی حرمتوں میں شریعت رخصت کا دروازہ کھول دیتی ہے، کیونکہ ان حرمتوں کی قیمت جان سے کم ہے، مگر خواہ آدمی کے گلے پر چھری ہی کیوں نہ رکھ دی جائے، شریعت اس بات کی اجازت کبھی نہیں دیتی کہ آدمی کسی عورت کی عصمت پر ہاتھ ڈالے، یا کسی بے قصور انسان کو قتل کر دے۔ اسی طرح خواہ کیسی ہی اضطرار کی حالت طاری ہو جائے شریعت دوسروں کے مال چرانے اور ان پر ڈاکہ زنی کر کے پیٹ بھرنے کی رخصت نہیں دیتی کیونکہ یہ برائیاں اپنے نفس کو ہلاکت میں ڈالنے کی برائی سے شدید تر ہیں۔

(۳) راستبازی و صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔ صلح بین الناس اور ازدواجی تعلقات کی درستی کے لیے اگر صرف صداقت کو چھپانے سے کام نہ چل سکتا ہو تو ضرورت کی حد تک جھوٹ سے بھی کام لینے کی شریعت نے صاف اجازت دی ہے۔ جنگ کی ضروریات کے لیے تو جھوٹ کی صرف اجازت ہی نہیں ہے بلکہ اگر کوئی سپاہی دشمن کے ہاتھ گرفتار ہو جائے اور دشمن اس سے اسلامی فوج کے راز معلوم کرنا چاہے تو ان کا بتانا گناہ اور دشمن کو جھوٹی اطلاع دے کر اپنی فوج کو بچانا واجب ہے۔ اسی طرح اگر کوئی ظالم کسی بے گناہ کے قتل کے درپے ہو اور وہ غریب کہیں چھپا ہوا ہو تو سچ بول کر اس کے چھپنے کی جگہ بتا دینا گناہ اور جھوٹ بول کر اس کی جان بچا لینا واجب ہے۔ اس معاملہ میں شریعت کے احکام ملاحظہ ہوں

عن ام کلثوم بنت عُقبة بن مُعیط قالت سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لیس الکذاب الذی یصلح بین الناس فینمی خیراً ویقول خیراً (متفق علیہ) وفی روایة مسلم زیادة قالت ولم اسمعه یرخص فی شیء مما یقوله الناس الا فی ثلث یعنی الحرب والاصلاح بین الناس وحدیث الرجل امرأته وحدیث المرأة زوجها۔

ام کلثوم بنت عُقبہ بن مُعیط سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلعم کو فرماتے سُنا کہ وہ شخص جھوٹا نہیں ہے جو لوگوں کے درمیان صلح کراتا ہے اور اس غرض کے لیے خیر پہنچاتا اور خیر کہتا ہے (بخاری و مسلم)۔ اور مسلم کی روایت میں اتنی بات اور زیادہ ہے کہ انھوں نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی معاملہ میں وہ باتیں کرنے کی اجازت دیتے ہوئے نہیں سنا جو لوگ کیا کرتے ہیں، مگر تین معاملات اس سے مستثنیٰ ہیں۔ ایک جنگ، دوسرے اصلاح بین الناس، تیسرے میاں اور بیوی کی باتیں۔

عن اسماء بنت یزید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا یحل الکذب الا فی ثلاث تحدث الرجل امرأته لیرضیها والکذب فی الحرب وفی الاصلاح بین الناس (ترمذی)

اسماء بنت یزید نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں کہ جھوٹ جائز نہیں ہے مگر تین چیزوں میں مرد کی بات عورت سے تاکہ وہ اس کو راضی کرے۔ جنگ اور اصلاح بین الناس۔

اس کی عملی مثالیں بھی احادیث میں موجود ہیں۔ کعب بن اشرف کے قتل کے لیے محمد بن مسلمہ کو جب حضورؐ نے مامور کیا تو انہوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں، حضورؐ نے بالفاظ صریح انہیں اسکی اجازت دی (بخاری، باب الکذب فی الحرب و باب الفتک باہل الحرب)۔ حجاج بن علاط نے غزوۂ خیبر کے موقع پر مکہ والوں کے قبضے سے اپنا مال نکالکر لانے کے لیے جھوٹ سے کام لینے کی اجازت مانگی اور حضورؐ نے ان کو بھی اسکی اجازت عطا فرمائی (احمد، نسائی، حاکم و ابن حبان)

ان نظائر کی بنا پر فقہاء و محدثین نے جو نتائج نکالے ہیں وہ بھی ملاحظہ فرما لیے جائیں۔ علامہ ابن حجر لکھتے ہیں:۔

اتفقوا علی جواز الکذب عند الاضطرار کما لو قصد ظالم قتل رجل وهو مختف عنده فله ان ینفی کونه عنده ویحلف علی ذلک ولا یأثم (فتح الباری۔ ج ۵۔ ص ۱۹۰)

علماء اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ شدید ضرورت پیش آنے پر جھوٹ بولنا جائز ہے مثلاً اگر ایک ظالم کسی شخص کو قتل کرنا چاہتا ہو اور وہ مظلوم کسی شخص کے پاس چھپا ہوا ہو تو اس کو حق پہنچتا ہے کہ اپنے پاس اسکے ہونے کا انکار کرے اور اس پر قسم کھالے ایسا کرنے میں وہ گناہ گار نہ ہوگا

علامہ ابن القیم حجاج بن علاط سُلمی کا واقعہ نقل کرنے کے بعد اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

ومنها جواز کذب الانسان علی نفسه وعلی غیرہ اذا لم یتضمن ضرر ذالک الغیر اذا کان یتوصل بالکذب الی حقه (زاد المعاد - ج ۲ ص ۲۰۳)

اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ آدمی کا اپنے متعلق یا کسی دوسرے کے متعلق جھوٹ بولنا ایسی حالت میں جائز ہے جبکہ دوسرے کا اس سے کوئی نقصان نہ ہو اور آدمی اس جھوٹ کے ذریعہ سے اپنا ایک جائز حق حاصل کرے۔

علامہ نووی ریاض الصالحین میں احادیث سے استدلال کرتے ہوئے یہ اصول بیان کرتے ہیں:

کل مقصود محمود یمکن تحصیله بغیر الکذب یحرم الکذب فیه وان لم یمکن تحصیله الا بالکذب جاز الکذب ثم ان کان تحصیل ذالک المقصود مباحا کان الکذب مباحا وان کان واجبا کان الکذب واجبا۔ (باب تحریم الکذب)

ہر اچھا مقصد جس کا حصول جھوٹ کے بغیر ممکن ہو اس کے لیے جھوٹ بولنا حرام ہے۔ لیکن اگر اس کا حصول جھوٹ کے بغیر ممکن نہ ہو تو جھوٹ جائز ہے۔ پھر اگر وہ مقصد ایسا ہو کہ اس کا حاصل کرنا مباح ہو تو اسکے لیے جھوٹ بھی مباح ہے اور اگر اس کا حصول واجب ہو تو اس کے لیے جھوٹ بھی واجب ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو یہاں بھی وہی قاعدہ کارفرما نظر آتا ہے کہ سچ بولنے اور جھوٹ سے اجتناب کرنے کی ایک اخلاقی قیمت ہے جس سے زیادہ قیمتی چیز کا نقصان ہو رہا ہو تو اس نسبتہً کم قیمت چیز کا نقصان گوارا کیا جا سکتا ہے، بلکہ بعض صورتوں میں گوارا کرنا چاہیے۔

(۴) غیبت کی حرمت اسلام میں جیسی کچھ شدید ہے وہ قرآن کے ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا (کیا تم میں سے کوئی شخص یہ پسند کریگا کہ اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھائے؟) لیکن کون نہیں جانتا کہ محدثین نے احادیث کی تحقیق کے لیے ہزارہا راویوں پر جرح کر ڈالی اور یہ سارا کام سراسر غیبت تھا کیا اس کے لیے کوئی دلیل جواز اس کے سوا پیش کی جا سکتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط باتوں کی نسبت اور دین میں حضورؐ کی سند سے ایسی باتوں کا رواج جو حضورؐ نے نہیں فرمائیں، غیبت کی بہ نسبت بہت بڑی برائی تھی، اس لیے اس بڑی برائی سے بچنے کے لیے اس چھوٹی برائی کو اختیار کرنا نہ صرف جائز بلکہ واجب تھا؛ اسی طرح اگر کوئی شریف آدمی کسی شخص کو بیٹی دے رہا ہو، یا کسی کے ساتھ شرکت کا معاملہ کر رہا ہو، اور آپ کو معلوم ہو کہ وہ شخص بداخلاق اور بدمعاملہ ہے، تو اس کی برائی بیان کرنا نہ صرف جائز بلکہ واجب ہے، کیونکہ ایک غریب لڑکی کی زندگی برباد ہونا، یا ایک شریف آدمی کا ایک بے ایمان آدمی کے پھندے میں پھنس جانا غیبت کی برائی سے زیادہ بڑی برائی ہے۔

(۵) غیر محرم عورت کو برہنہ کرنا اسلام کے صریح احکام کی رُو سے قطعاً حرام ہے۔ لیکن فتح مکہ سے پہلے حضرت حاطب بن ابی بلتعہ نے جس عورت کے ذریعہ سے اہل مکہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادے کی اطلاع لکھ کر بھیجی تھی اسے حضرت علیؓ

راستے میں گرفتار کرتے ہیں اور خط کی تلاشی کے لیے اس کے کپڑے اتارنے کی دھمکی دیتے ہیں۔ ابن القیم نے اس سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ مصلحتِ اسلام و مسلمین کی خاطر تفتیش کی ضرورت پیش آئے تو عورت کو برہنہ کیا جا سکتا ہے (زاد المعاد ج ۲ ص ۲۳۹)

(۶) اسلام میں نماز کی اہمیت جیسی کچھ ہے، بیان کی حاجت نہیں۔ لیکن بخاری و مسلم کی متفق علیہ روایت ہے کہ بنی عمرو بن عوف کے ہاں ایک جھگڑے میں صلح کرانے کے لیے رسول اللہ صلعم تشریف لے گئے، نماز کا وقت آیا اور حضور اصلاح بین الناس کے کام میں مشغول رہے، آخر کار حضرت ابوبکر کی امامت میں جماعت کھڑی ہو گئی اور حضور بعد میں آکر جماعت میں شریک ہوئے۔

(۷) انکارِ منکر شریعتِ حقہ کے نہایت اہم واجبات میں سے ہے اور اس باب میں خدا اور رسول کے تاکیدی احکام کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں لیکن جب یہی چیز ایک منکر سے عظیم تر منکر رونما ہونے کی موجب ہوتی نظر آئے تو اس سے اجتناب واجب ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بنا پر فاسق و فاجر امراء کے خلاف خروج کرنے سے منع فرما دیا اور حکم دیا کہ من رای من امیرہ مایکرھہ فلیصبر ولا ینزعن یداً من طاعتہ۔

(۸) اسلام میں اقامت حدود کے لیے جیسے سخت تاکیدی احکام ہیں ان سے کون صاحبِ علم ناواقف ہے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے موقع پر چوروں کے ہاتھ کاٹنے سے منع فرما دیا (ابوداؤد) اور حضرت عمرؓ نے فرمان جاری کیا کہ جب کوئی فوج دشمن کے علاقے میں جنگ کر رہی ہو اس وقت وہاں کسی مسلمان پر حد جاری نہ کی جائے، کیونکہ اس سے اندیشہ تھا کہ کہیں کسی شخص پر حمیتِ جاہلیہ کا غلبہ نہ ہو جائے اور وہ دشمن سے نہ جا ملے (اعلام الموقعین جلد ۳ ص ۲۹-۲۴)۔ یہ معاملہ حالتِ جنگ تک ہی محدود نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعۂ افک میں تین مخلص مومنوں پر حدِ قذف جاری فرمائی مگر عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین کو چھوڑ دیا۔ ابن القیم اس کے وجوہ بیان کرتے ہوئے ایک وجہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ حضور نے اُس پر حد جاری کرنے سے اجتناب ایک ایسی مصلحت کی بنا پر کیا جو اقامتِ حد کی بہ نسبت زیادہ اہم تھی، اور یہ وہی مصلحت تھی جس کی بنا پر حضور اس سے پہلے بھی اس کا نفاق کھل جانے اور اس کی بہت سی موجبِ قتل باتیں سننے کے باوجود اس کو سزا دینے سے اجتناب فرماتے رہے تھے۔ وہ مصلحت یہ تھی کہ یہ شخص اپنے قبیلے میں با اثر تھا، اس کی بات ان میں چلتی تھی۔ اندیشہ تھا کہ اس پر حد جاری کی گئی تو فتنہ برپا ہو جائیگا۔ اس لیے حضور نے اس کے قبیلے کی تالیفِ قلب کرنا پسند فرمایا اور یہ مناسب نہ سمجھا کہ اس پر حد جاری کر کے ان لوگوں کو اسلام سے برگشتہ کر دیا جائے" (زاد المعاد ج ۲ ص ۱۶۱)

(۹) مالِ غنیمت میں تمام شرکائے جنگ کے حقوق یکساں ہیں اور وہ ان میں برابری کے ساتھ تقسیم ہونا چاہیے۔ اس معاملہ میں شریعت کے احکام بالکل واضح ہیں اور یہی انصاف کا تقاضا بھی ہے۔ لیکن غزوۂ اوطاس کے اموالِ غنیمت میں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش اور دوسرے قبائل کے مؤلفۃ القلوب کو خوب دل کھول کر عطیے دیئے اور انصار کو کچھ نہ دیا۔ انصار نے اس کی بحث شکایت کی تو حضورؐ نے اپنے اس فعل کی مصلحت یہ بتائی کہ یہ لوگ تالیفِ قلب کے محتاج ہیں اس لیے یہ دولت ان میں لٹا دی گئی ہے، الا ترضون یا معشر الانصار ان یذھب الناس بالشاۃ والبعیر وترجعون برسول اللہ الی رحالکم (اے گروہ انصار کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے جائیں اور تم رسول اللہ کو لیکر اپنی اقامت گاہوں کی طرف پلٹو؟)

ان مثالوں سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ دین کے سارے اصول اور احکام اپنی قدر و قیمت اور اپنے وزن میں یکساں نہیں ہیں بلکہ ان کے درمیان مراتب کا فرق ہے، اور دین کا ہر قاعدہ بے لچک نہیں ہے بلکہ اس کے بہت سے قواعد میں لچک کی گنجائش ہے۔ اس باب میں اصولی ضابطہ یہ ہے کہ ایک چھوٹی نیکی سے اگر بڑا گناہ لازم آتا ہو تو اس کا ترک اولیٰ ہے، اور ایک چھوٹی برائی اگر کسی بڑی نیکی یا عظیم تر دینی مصلحت کے لیے ضروری ہو تو اسے اختیار کر لینا بہتر ہے، اور دو برائیوں میں سے کسی ایک میں مبتلا ہونا بہر حال ناگزیر ہو جائے تو نسبتاً کم تر درجے کی برائی کو قبول کر لینا چاہیے۔ اس کے ساتھ انہی مثالوں سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ نظامِ شریعت میں قدروں کے درمیان فرقِ مراتب کا معیار کیا ہے، کس طرح کی چیزوں پر کس طرح کی چیزوں کو فوقیت دی گئی ہے، اور کونسی قدریں ایسی ہیں جن سے بالاتر قدر کوئی نہیں ہے کہ اس پر انہیں قربان کیا جا سکتا ہو۔ میں نے زیر بحث عبارتوں میں جو کچھ لکھا تھا اس کی بنیاد یہی کچھ تھی۔ اب جن لوگوں نے اپنی طرف سے کچھ معنی آفرینیاں کی ہیں اور انہیں میرا مسلک قرار دے کر مجھ پر طرح طرح کے گھناؤنے الزامات لگائے ہیں ان کی باتوں سے میں بری الذمہ ہوں، اپنی ان باتوں کے لیے وہ خود ہی اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہ ہیں۔

رہی وہ بحث جو الائمۃ من قریش سے میرے استدلال پر کی گئی ہے تو اس کے متعلق میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ جو کچھ میں نے دسمبر ۵۶ء کے ترجمان القرآن میں بالاجمال لکھا ہے اسے اپریل ۴۶ء کے ترجمان القرآن میں بتفصیل لکھ چکا تھا، اور وہ میری کتاب رسائل و مسائل جلد اوّل کے صفحات میں بھی ستمبر ۵۱ء سے موجود تھا مگر اس میں سے وہ کیڑے کبھی برآمد نہ ہوئے تھے جو دسمبر ۵۶ء کے ترجمان کی مختصر عبارت سے یکایک برآمد ہونے شروع ہو گئے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اسے عالم السرائر والخفایا ہی بہتر جانتا ہے اور اسی کا جاننا کافی ہے۔ بہر حال یہ بات تو سب طالبانِ علم کو معلوم ہونی چاہیے کہ آیا اُن احادیث کی صحت سے انکار ہے جن کی بنا پر حضور کی وفات کے بعد آپ کی جانشینی کے لیے قریش کو ترجیح دی گئی تھی؟ اور کیا اس واقعہ سے انکار ہے کہ سقیفۂ بنی ساعدہ کے وقت سے لیکر صدیوں تک انہی احادیث کی بنا پر قریش کو خلافت کے لیے ترجیح دی جاتی رہی حتیٰ کہ ایک مدت دراز تک فقہائے اسلام قرشیت کو

خلافت کے لیے شرط سمجھتے رہے ہیں، یا ان احادیث اور حقائق کی صحت تسلیم کرنے کے بعد وہ اعتراضات کیے گئے ہیں جو سائل نے اپنے سوال میں معترضین کے مضامین سے نقل کیے ہیں؟ اگر پہلی بات ہے تو ان احادیث اور تاریخی واقعات پر ایک علمی تنقید ہونی چاہیے تاکہ ہم جیسے ناواقف لوگوں کے علم میں بھی کچھ اضافہ ہو جائے۔ اور اگر دوسری بات ہے تو پھر سوچ لینا چاہیے کہ ان اعتراضات کا ہدف دراصل کون ہے اور میری منہ میں یہ گندگی کے چھینٹے کس دامنِ پاک پر پھینکے جا رہے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک بات اور بھی قابلِ ذکر ہے۔ دراصل یہ بحث شروع اس طرح ہوئی تھی کہ جماعت اسلامی نے ۱۹۵۱ء کے انتخابات کے موقع پر ایک پالیسی کا اعلان کیا تھا اور وہ یہ تھی کہ امیدواری چونکہ اسلام میں ناجائز ہے اس لیے ہم نہ خود امیدوار بن کر کھڑے ہوں گے نہ کسی امیدوار کو ووٹ دیں گے۔ بعد میں تجربات سے ہم کو معلوم ہوا کہ ہم ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ ہر ضمنی اور عام انتخاب میں پورے ملک کی ہر نشست کے لیے اپنے معیارِ مطلوب کے مطابق موزوں آدمی کھڑے کر سکیں۔ اس حالت میں تین قسم کے آدمی بالعموم میدان میں آتے ہیں۔ ایک وہ جو سرے سے نظامِ اسلامی ہی کے مخالف ہیں اور پاکستان کو ایک لادینی ریاست بنا دینا چاہتے ہیں۔ دوسرے وہ جو نظامِ اسلامی کی مخالفت تو نہیں کرتے مگر اس کی حمایت میں بھی مشکل ہی سے مخلص مانے جا سکتے ہیں اور اپنے اعمال کے لحاظ سے بھی ناقابلِ اعتماد ہیں۔ تیسرے وہ جن کے دامن بھی بداعمالیوں سے داغدار نہیں ہیں اور نظامِ اسلامی کے لیے جن کے اخلاص پر بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن امیدواری کی صفت ان سب میں پائی جاتی ہے، کیونکہ ہمارے ملک میں یہی طریقہ مدت سے رائج ہے اور یہاں کے علماء تک امیدوار بن کر کھڑے ہونے میں مضائقہ نہیں سمجھتے، بلکہ بکثرت علماء کو فقہی حیثیت سے بھی اس طرح کی امیدواری کے ناجائز ہونے میں کلام ہے۔ اب اگر ہم اس بات پر اصرار کریں کہ ان تینوں قسم کے امیدواروں کے ساتھ یکساں معاملہ کریں گے اور سب کے حق میں اپنے ووٹ استعمال کرنے سے مجتنب رہیں گے تو نتیجہ یہ ہو گا کہ ہم پہلی دو قسموں کے لوگوں کی کامیابی کے لیے راہ ہموار کر دیں گے اور تیسری قسم کے لوگوں کے ساتھ نظامِ اسلامی کے قیام کی کوشش میں ہمارا تعاون بھی مشکل ہی سے برقرار رہ سکے گا۔ اس طرح ہم ایک نسبتہً چھوٹے درجے کی اور ضمنی اصلاح (امیدواری کے عدمِ جواز) کی خاطر ایک بڑی چیز (پورے ملک میں نظامِ اسلامی کے قیام) کو نقصان پہنچانے کے مرتکب ہوں گے، حالانکہ اسلامی نقطۂ نظر سے اصل مقصدی اہمیت امیدواری کے طریقے کی اصلاح کو نہیں بلکہ نظامِ اسلامی کے قیام کو حاصل ہے جس کے قائم ہو جانے کے بعد تمام دوسری اصلاحات کے ساتھ امیدواری کے طریقے کی بھی اصلاح ہو سکتی ہے۔ اس

## (بقیہ اشارات)

لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَا مِنْكَ اِلَّا اِلَيْكَ۔ بھی تیری ہی طرف ہے اور خوف بھی تجھی سے ہے۔ تیری پکڑ سے بچنے کے لیے تیرے ہی دامن کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں۔

عن عمر رضی اللہ عنہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لو انکم تتوکلون علی اللہ حق توکلہ لرزقکم کما یرزق الطیر، تغدو خماصاً وتروح بطاناً (ترمذی)

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے فرماتے تھے کہ اگر تم اللہ پر بھروسا کرو جیسا اس پر بھروسا کرنے کا حق ہے تو تم کو وہ اسی طرح رزق دیگا جیسے چڑیوں کو دیتا ہے، صبح کو خالی پیٹ جاتی ہیں اور شام شکم سیر واپس آتی ہیں۔

---

قرآن مجید میں بے شمار مقامات پر اس امر کی وضاحت بھی ملتی ہے کہ ایک مومن و مسلم کے لیے حالات کی سازگاری یا ناسازگاری کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ حالات بظاہر کس قدر نامساعد ہی کیوں نہ ہوں لیکن جب خالقِ کائنات ان کو بدلنے کا ارادہ کرتے تو پھر وہ موید اور معاون بن جاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جو واقعہ سورۃ الشعراء میں بیان کیا گیا ہے وہ اس حقیقت پر پوری طرح دلالت کرتا ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لیکر اپنے ملک سے نکلے تو اُن کے تعاقب میں فرعون کی فوجیں بھی بھاگتی ہوئی آگئیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو وہ گھبرا اٹھے اور کہا: اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ”ہم تو پکڑے گئے“ لیکن ان کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے جو خداوند تعالیٰ پر اعتماد کی لازوال نعمت سے مالا مال تھے بڑے اطمینان سے فرمایا: كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ۔ ”ہرگز نہیں، میرے ساتھ میرا رب ہے جو مجھے راہ بتلائے گا“۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے اعتماد کو پورا کر دکھایا جس کی تفصیل قرآنِ مجید نے یوں بیان فرمائی ہے:

فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ؕ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ

پھر ہم نے موسیٰ کو حکم دیا کہ اپنا عصا سمندر پر مار۔ پس سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر ٹکڑا اس طرح ہو گیا جیسے ایک بڑا

وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِیْنَ وَاَنْجَیْنَا مُوْسٰی وَمَنْ مَّعَہٗ اَجْمَعِیْنَ۔ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِیْنَ ۝ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً وَمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَ وَاِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ۔

پہاڑ کھڑا ہو۔ اور ہم اسی جگہ دوسروں کو لے آئے، موسیٰ اور اس کے سب ساتھیوں کو بچا نکالا اور دوسروں کو غرق کر دیا۔ اس میں ایک نشانی ہے مگر ان میں سے اکثر لوگ ماننے والے نہ تھے۔ اور تیرا رب وہی ہے بڑا زبردست رحم والا۔

اسی سلسلہ میں دوسرا واقعہ جو قابلِ غور ہے وہ رسالتمآب کی ہجرت ہے۔ جب حضورؐ مکہ سے مدینہ تشریف لے جاتے ہوئے غارِ ثور میں پناہ گزیں تھے تو دشمن عین غار کے سر پہ آ گئے۔ اس حالت پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کو بھی سخت خوف لاحق ہوا اور وہ سوچنے لگے کہ اگر ان ظالموں میں سے کسی نے ذرا آگے بڑھ کر غار میں جھانک لیا تو ہمیں دیکھ لے گا۔ اس موقع پہ اُس ذاتِ مقدس نے بڑے سکون اور اطمینان سے کہا:

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا — ڈرو نہیں، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

اسی واقعہ کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضورؐ کی زبانِ فیض ترجمان سے یوں نقل فرمایا ہے:

نظرت الی اقدام المشرکین ونحن فی الغار وھم علیٰ رؤسنا، فقلت یارسول اللہ لوان احدھم نظر تحت قدمیہ لابصرنا۔ فقال ماظنك یا ابا بکر باثنین اللہ ثالثھما؟ (بخاری۔ مسلم)

میں نے مشرکین کے قدم دیکھے۔ ہم غار میں تھے اور وہ ہمارے سروں پہ۔ میں نے کہا یارسول اللہ اگر ان میں کا ایک شخص بھی اپنے قدموں کی طرف دیکھے تو ہمیں دیکھ لے گا۔ آپ نے فرمایا! اے ابوبکرؓ تم ایسے دو کے متعلق کیا گمان کرتے ہو جن کا تیسرا اللہ ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ اس سب سے بڑی کامیابی اور کامرانی پر، جو مسلمانوں کو جنگِ بدر میں حاصل ہوئی، یہ ذہن نشین کراتا ہے کہ اس کامرانی میں تمہاری کسی تدبیر کا دخل نہ تھا بلکہ یہ محض اُسی کے فضل سے ہوا کہ تمہیں ایسی شاندار فتح سے نوازا گیا جو تمہارے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتی تھی۔

اِذْ ھَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْکُمْ اَنْ تَفْشَلَا — یاد کرو جب تم میں سے دو گروہ کمزوری دکھانے پر آمادہ

وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

(آل عمران - ۱۳)

ہو گئے تھے، حالانکہ اللہ ان کی مدد پر موجود تھا اور مومنوں کو اللہ پر ہی بھروسا رکھنا چاہیے۔ آخر اس سے پہلے جنگ بدر میں اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کر چکا تھا حالانکہ اس وقت تم بہت کمزور تھے۔ لہٰذا تم کو چاہیے کہ اللہ کی ناشکری سے بچو، امید ہے کہ اب تم شکر گزار ہو گے۔

مندرجہ بالا آیت میں خداوند تعالیٰ نے بڑے ہی لطیف پیرائے میں مسلمانوں کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے کہ تمہیں جب بھی کسی میدان میں فتح اور کامیابی نصیب ہو تو تم یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ یہ تمہاری ذاتی کوششوں اور محنتوں کا ثمر ہے بلکہ تمہیں ہمیشہ اس امر کا احساس رہنا چاہیے کہ اس دنیا میں جو کچھ فضل تم پر کیا جاتا ہے وہ محض تمہارے خالق اور مالک کا انعام واکرام ہے۔ اس لیے تمہیں بجائے اپنی کامیابیوں پر اترانے کے، اُس کے حضور میں شکر بجالانا چاہیے اور تم جتنا زیادہ اس کے شکر گزار ہو گے وہ اسی تناسب سے تمہیں اپنے فضل سے نوازتا چلا جائے گا۔

فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ

(البقرہ - ۸)

پس اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم کبھی کے تباہ ہو چکے ہوتے۔

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ

(الفاطر - ۱)

جو کچھ رحمت بھی اللہ تعالیٰ لوگوں پر کھول دے کوئی اس کو روکنے والا نہیں اور جو کچھ روک رکھے اسے کھولنے کی طاقت بھی اللہ کے بعد کسی میں نہیں ہے اور وہی زبردست حکمت والا ہے۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ

(ابراہیم - ۱)

اور یاد کرو جبکہ تمہارے رب نے خبردار کر دیا تھا کہ اگر تم شکر ادا کرو گے تو تمہیں اور بھی دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب البتہ شدید ہے۔

معاملہ پھر یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ خداوند تعالیٰ نے مایوسی اور قنوطیت کو ایمان کی عین ضد قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ جو لوگ ان بیماریوں میں مبتلا ہیں وہ چاہے زبان سے نہ کہیں مگر حقیقت میں ان کا بھروسا یا تو اپنی طاقتوں پر ہے، خدا پر ان کی نظر نہیں ہے، یا ان کے نزدیک اُن کا خدا بالکل مجبور اور بے بس ہے جس کا مادی حالات کے سامنے کوئی زور نہیں چلتا، یا پھر وہ سمجھتے ہیں کہ اُس نے اپنی رحمت سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ اس قسم کے خیالات صرف اُسی شخص کے ذہن میں آسکتے ہیں جو یا تو خدا کو ایک با اختیار اور با جبروت ہستی نہیں مانتا یا وہ اُس ذات باری تعالیٰ کے متعلق ایک نہایت ہی تاریک تصور رکھتا ہے:

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (زمر-۶) اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔

اسی مضمون کو سورۃ الحجر میں ابراہیم علیہ السلام کے قصّہ میں بیان فرمایا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب بڑھاپے میں بیٹے کی بشارت دی گئی تو آپ بظاہر اس ناممکن بات پر سخت حیران ہوئے اور کہا:

اَبَشَّرْتُمُوْنِیْ عَلٰۤى اَنْ مَّسَّنِیَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ - قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِیْنَ - قَالَ وَمَنْ یَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ - (الحجر-۴)

(ابراہیمؑ نے کہا) کیا تم اس بڑھاپے میں مجھے اولاد کی بشارت دیتے ہو؟ (ذرا سوچو تو سہی کہ) یہ کیسی بشارت تم مجھے دے رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا ہم تمہیں برحق بشارت دے رہے ہیں، تم مایوس نہ ہو۔ ابراہیم نے کہا اپنے رب کی رحمت سے مایوس تو گمراہ لوگ ہوا کرتے ہیں۔

سورۂ یوسف میں اسی ناامیدی کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جب حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹوں کو یوسف علیہ السلام اور اُس کے بھائی کی تلاش میں بھیجتے ہیں تو اُن سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں:

یٰبَنِیَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ یُّوْسُفَ میرے بچو! جاکر یوسف اور اس کے بھائی کی کچھ ٹوہ

وَ اَخِيْهِ وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ط اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (یوسف - ۱۰)

دیکھو، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اس کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں۔

یہ سب آیات جو پچھلے صفحات میں درج کی گئی ہیں اس حقیقت کی آئینہ دار ہیں کہ ایک خدا پرست انسان کو، جو ایک زندہ وجاوید اور صاحبِ اختیار خدا پر ایمان رکھتا ہے، کبھی مایوس نہ ہونا چاہیے۔ اس کا فرض صرف اسی قدر ہے کہ وہ ہر حال میں نتائج سے یکسر بے پروا ہو کر اپنے مولا اور آقا پر بھروسا کرتے ہوئے اس کے منشا کو پورا کرنے کی فکر کرے۔ جس ذات کی بندگی اور اطاعت کو وہ اپنی زندگی کی غایتِ اُولیٰ سمجھتا ہے وہ علیم و خبیر ہے، بے پناہ قوت اور طاقت کی مالک ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتی ہے۔ وہ ذات اسے ایسے راستوں اور طریقوں سے مدد بہم پہنچائیگی کہ ان کے بارے میں اُسے کبھی وہم و گمان بھی نہ گزرا ہو۔ ایک منکرِ خدا جب ماحول کی ناسازگاری دیکھ کر مایوس ہوتا ہے تو اس کی اس کیفیت کی وجہ تو سمجھ میں آسکتی ہے۔ جو شخص ناپائدار دنیا اور اُس کے اسباب و وسائل کو اپنا معبود سمجھ بیٹھا ہو، وہ اگر کسی وقت یاس و قنوط کا شکار ہو جائے تو بالکل فطری چیز ہے، لیکن اس چیز کی توجیہ سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک انسان خدائے لم یزل پر ایمان کا دعویٰ بھی کرے مگر اس کے ساتھ ساتھ حالات کی نامساعدت دیکھ کر ہمت ہار بیٹھے۔ وہ ایک طرف ایسی ہستی کے وجود کا زبان سے اقرار بھی کرے جو ہر قسم کی حسن وخوبی کا سرچشمہ ہے، ہر کمال کی خالق ہے، سارے موجودات کی مالک اور حاکم ہے، جس کے قوانین اٹل، جس کے ضابطے بے لاگ اور جس کی رحمت ہر چیز پر حاوی ہے، مگر دوسری طرف اپنی زندگی میں اصل اور فیصلہ کن چیز دنیاوی مال و متاع کو خیال کرے۔ یہ دورنگی ایک مسلمان کو کسی طرح زیب نہیں دیتی۔ ایک مومن و مسلم کے لیے زندگی گزارنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ وہ اپنے خالق اور مالک کی مدد پر بھروسا رکھے اور ہر کام کو اس احساس کے ساتھ شروع کرے:

حَسْبِیَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (التوبہ - ۱۶)

میرے لیے بس اللہ ہی کافی ہے کوئی معبود نہیں مگر وہ، اُسی پر مَیں نے بھروسا کیا اور وہ مالک ہے عرشِ عظیم کا۔

اُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ (المومن - ۵)

میں اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کرتا ہوں بیشک وہ بندوں پر نگاہ رکھنے والا ہے

وَمَا تَوْفِيْقِیْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ اُنِيْبُ - (ہود - ۸)

اور جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اس کا انحصار اللہ کی توفیق پر ہے اسی پر میرا بھروسا ہے اور ہر معاملہ میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں

خالی صفحه

# تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہء عمل

از

مولانا سید ابوالاعلی مودودی

یہ مولانا مودودی کی وہ تقریر ہے جو آپ نے فروری ۱۹۵۷ء میں ماچھی گوٹھ کے اجتماع عام میں کی تھی - اس میں آپ نے بڑی تفصیل کے ساتھ یہ واضح کیا ہے کہ جماعت اسلامی ابتدا سے آجتک کس پالیسی پر کام کرتی رہی ہے - کن کن مراحل سے گذر کر آئی ہے - تقسیم ہند سے قبل حالات کیا تھے - ان حالات میں جماعت کا طریق کار کیا تھا - تقسیم کے بعد حالات میں کیا تغیر رونما ہوا اور اسکے تقاضے کیا تھے - ایک لا دینی ریاست کو اسلامی ریاست میں بدلنے کے لئے جماعت کا فریضہ کیا تھا اور اس نے اسے کس حد تک انجام دیا - پیش نظر انقلاب اور اصلاح معاشرہ کی واحد صورت کیا ہے -

قیمت ۰۰-۱۲-۲ روپے

---

# تزکیہء نفس

از

مولانا امین احسن اصلاحی

* انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد کیا ہے ؟
* انسانی معاشرے کی فلاح اور انسان کی نجات اخروی کا انحصار کس چیز پر ہے ؟
* کیا "تزکیہ" کا علم کوئی راز ہے ؟
* کیا "تزکیہ" کا اصل موضوع انسان کی محض انفرادی زندگی ہے ؟
* علم حقیقی کا سرچشمہ کہاں ہے ؟
* معرفت الہی کا صحیح مفہوم اور اسکے حصول کا صحیح طریقہ کیا ہے؟
* وہ کون سے عوامل ہیں جو معرفت الہی کے حصول میں حجاب اور سد راہ بنتے ہیں ؟

یہ جاننے کے لئے آپ مولانا اصلاحی کی تازہ کتاب تزکیہ نفس کا مطالعہ کیجئے

قیمت ۰۰-۸-۳ روپے

ملنے کا پتہ :

* مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان - اچھرہ - لاہور
* سیل ڈپو مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی - مسلم مسجد